جوش بانی ۳

جوشیات پر مشتمل ایک عالمی جریدہ
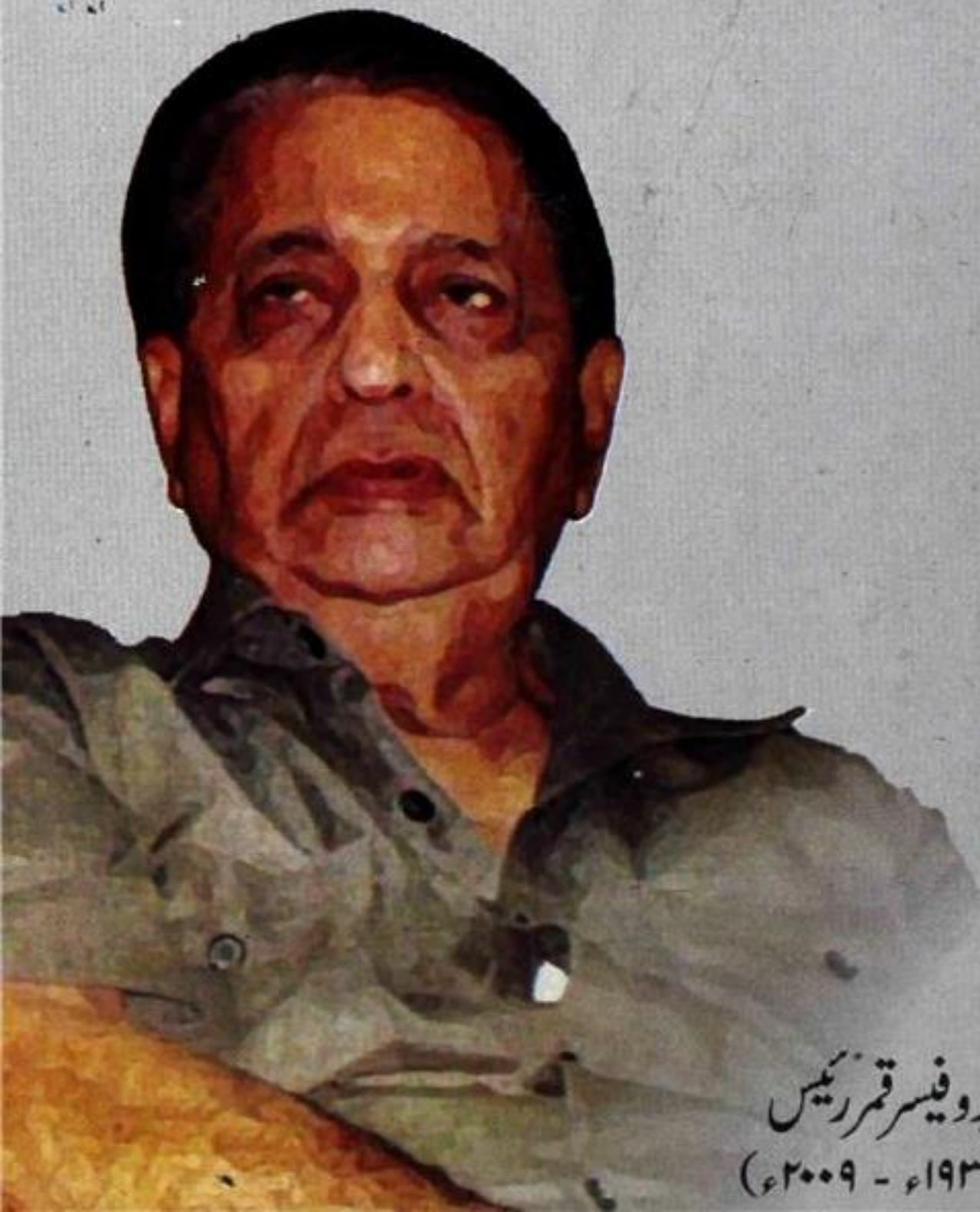
پروفیسر قمر رئیس
(۱۹۳۲ء - ۲۰۰۹ء)

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----۞۞۞۞۞۞۞۞۞-----

کلیات غالب فارسی

(دو جلدوں میں)

تحقیق، تدوین، تنقید، ترجمہ و تشریح

ڈاکٹر سید تقی عابدی

عہد حاضر کے معروف محقق، ناقد اور دانشور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے غالب کے فارسی کلام کے مختلف مستند مخطوطات اور مطبوعات حاصل کر کے اُن کی ترتیب و تدوین کے ساتھ اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے اور آج کی ضرورتوں کے مطابق اُسے نہایت ہی سلیقے کے ساتھ آراستہ کر کے اردو و فارسی ادب میں ایک بڑے خلا کو پُر کیا۔ ۱۴۰۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب غالبیات میں ایسا اضافہ ہے جسے اہلِ ذوق میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اس کتاب کو غالب انسٹی ٹیوٹ نے نہایت اہتمام سے فوٹو آفسیٹ کے ذریعہ عمدہ سفید کاغذ پر مضبوط جلد، دلکش سرورق کے ساتھ چھاپا ہے۔

ادارہ بڑی مسرت کے ساتھ اسے اہلِ علم کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

قیمت: جلد اوّل: ۶۰۰ روپے۔ جلد دوم: ۴۰۰ روپے

غالب انسٹی ٹیوٹ

ملنے کا پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲

فون: 23232583 ۔ ای میل: ghalib@vsnl.net

جوش بانی - ۳

مرتبین

قمر رئیس

اقبال حیدر

مدیر

علی احمد فاطمی

معاونین

فخر الکریم

صالحہ زرّیں

نعیم السحر

عبدالحی

Josh Bani - 3 (Jan-Jun '09)

Published by : Josh Literary Society (India - Canada)
Price : Rs. 50.00 (India)
Rs. 100.00 (Pakistan)

جوش بانی - ۳ جنوری تا جون ۰۹ء
کتابت : شارپ ٹریک کمپیوٹرز، الہ آباد (shadabmz@rediffmail.com)
طباعت : سٹی آفسیٹ پریس، الہ آباد
سرورق : شاداب مسیح الزماں
قیمت : ۵۰ روپے (ہندوستان)، ۱۰۰ روپے (پاکستان)
پتہ : ۶۸، مرزا غالب روڈ، الہ آباد، انڈیا
+9910153058 (دہلی) +9415306239 (الہ آباد)
+(403) 2410834 (کنیڈا)

==========زیر اہتمام==========

جوش لٹریری سوسائٹی، انڈیا، کنیڈا

فہرست

اداریہ

ہم نے اس سے قبل بھی کہا تھا کہ جوش بانی جاری کرنے کا مقصد آنکھ بند کر کے جوش کی حمایت نہیں اور نہ ہی عوامی اور انقلابی شاعری کی حمایت اور طرفداری کرنا۔۔۔ بلکہ ایک یہ احساس کہ ایک عمدہ اور بڑے شاعر کو منصوبہ بند طریقہ سے نظر انداز کیا گیا۔۔۔ یہ نظر اندازی اور بے توجہی کیوں۔۔۔ جواب اور تلاش میں اس کے بہت سے اسباب نظر آئے۔۔۔ جوش اور عہد جوش نظر آئے۔ اگر ایک طرف جوش کی بے باکی اور سخت کلامی تو دوسری طرف سیاست دانوں اور دیگر چھٹ بھیوں کے چھوٹے قد اور چھوٹے ذہن بھی کام کرتے رہے کہ ہر بڑی اور بے باک چیز ایک اسٹیج پر پہنچ کر نزاعی شکل اختیار کر لیتی ہے پھر جوش کو تو تنازعہ سے لطف آتا تھا۔ یہ تنازعہ تھوڑا بہت ہندوستان میں بھی تھا لیکن جوش کے پاکستان چلے جانے اور وہاں کے نظام سیاست اور معاشرت پر بے باکانہ بلکہ بے حجابانہ طنز و تمسخر نے تو اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔۔۔ اور ''ملیح آباد'' کا یہ پٹھان ''اسلام آباد'' میں کیا سے کیا ہو گیا۔ پنجاب کے اپنے معاملات تھے اقبال و فیضؔ کے مقابلے وہ کسی غیر پنجابی کو کیا اہمیت دیتے معاملات اور بھی بہت کچھ ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے بقول اقبال حیدر۔ ''ہندوستان نے جوش کو پاکستان جانے اور پاکستان نے آنے کو آج تک معاف نہیں کیا۔۔۔'' بات اگرچہ بالکل درست ہے لیکن شاید یہ بات کل تک ضرور سچ تھی اب بظاہر یہ سچ ٹوٹتا بکھرتا نظر آرہا ہے۔۔۔ کہ گذشتہ برس (نومبر ۰۸ء) کراچی اور لاہور کی عالمی کانفرنس میں جس انداز سے جوش پر سیمینار ہوئے اور جس طرح سے ان کے کارناموں کو یاد کیا گیا اس سے بہت سارے بھرم ٹوٹتے نظر آرہے ہیں۔ اس کانفرنس اور سیمینار میں ہندو پاک کے بڑے بڑے ادیبوں نے شرکت کی (راقم الحروف بھی شامل تھا) سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا غالباً پہلی بار پاکستانی دانشوروں نے جوش کی خدمات کا کھلے دل و دماغ سے

اعتراف کیا۔ ممتاز ادیب و دانشور محمد علی صدیقی نے نہایت جرأت و جسارت کے ساتھ کہا کہ جوش نے جو بڑے کارنامے پاکستان میں انجام دئے وہ تو ہندوستان میں بھی نہ کر سکے کیونکہ ہندوستان کے مقابلے پاکستان کا معاشرہ زیادہ سخت گیر رہا ہے۔ اس تنگ نظری، عصبیت و دقیانوسیت کے خلاف جوش نے جس بے باکی سے مظاھرہ کیا اس کی آج زیادہ ضرورت ہے کیونکہ پاکستان کا موجودہ معاشرہ، طالبان کی بڑھتی ہوئی مداخلت، جھگڑے، دہشت گردی وغیرہ نے پاکستان کی سیاست اور معاشرت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے یہ بات اب کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ حالات جس طرح کے ہوتے ہیں ادب اور ادبی نظریات بھی اسی سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ لاہور میں جوش پر سمینار ہونا اور وھیں کے لوگوں کا ذمہ داری اور دانشوری کے ساتھ مقالات پڑھنا اور بھی بہت کچھ بدلا بدلا سا، بہت سارے ذہنی بدلاؤ کی طرف اشارے کرتا ہے۔۔۔ ہم ان تبدیلیوں کا استقبال کرتے ہیں صرف اس لئے نہیں کہ یہ بھی جوش شناسی کا حوالہ ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ایسے ماحول میں جوش جیسے شاعر اور جوش جیسی عوامی اور احتجاجی شاعری کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور وہ شاعری جس کا انحصار اکثر معیار پرستانہ اور سرمایہ دارانہ اقدار پر ہوا کرتا تھا وہ پس منظر میں چلی گئی۔ اس حوالہ سے اکثر نے اور راقم الحروف نے بھی غزل کی شعریات پر سوالات قائم کئے اور بار بار کہا کہ عوامی و احتجاجی شاعری کو آج کے تناظر میں جانچنے پرکھنے کی ضرورت ہے اور اب یہ کام بھی شروع ہو گیا ہے جوش کے حوالے سے ہی سہی۔

اپنی باتوں کی مزید وضاحت و تقویت کے لئے ہم اس شمارے میں پاکستانی ادیبوں کے ہی مقالات زیادہ پیش کر رہے ہیں جس سے ہماری باتوں کا اندازہ ہوگا۔۔۔ اور بدلے ہوئے مزاج کا بھی۔۔۔ شخصیت کے حوالے سے کچھ مقالات پرانے ہیں۔ لیکن قیصر تمکین کا مضمون بالکل نیا ہے اور بطور خاص جوش بانی کے لئے لکھا گیا ہے جس کے لیے ہم ان کے بیحد شکر گذار ہیں۔ اس بار رباعیوں اور یادوں کی برات پر مضامین زیادہ ہو گئے ہیں اس لئے ہم نے الگ الگ گوشے بنا دیے ہیں۔۔۔ تبصرے کے کالم میں اس بار صرف پاکستانی کتابوں پر ہی تبصرے ہیں۔ گوشۂ خطوط میں جناب امین اشرف اور آزاد صاحب کے خطوط ضرور ملاحظہ کیجئے کہ بے لوث انداز میں لکھے گئے ہیں۔ آئندہ شمارے میں ہم ہندوستان کے متعدد ادیبوں و نقادوں

کے مضامین پیش کریں گے جو ہندوستان میں نئی جوش فہمی کے در کھولیں گے۔۔۔آپ ہماری ان کوششوں کو معروضی نگاہ سے دیکھئے تو سب کچھ صاف نظر آئے گا کہ اب صفائی و بے باکی کی بڑی ضرورت ہے۔

---علی احمد فاطمی

آہ قمر رئیس

ابھی یہ شمارہ پریس جا ہی رہا تھا کہ دہلی سے یہ روح فرسا خبر آئی کہ اردو کے ممتاز ترقی پسند ادیب و ناقد پروفیسر قمر رئیس اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

گذشتہ دنوں وہ بیمار تھے اکثر بخار رہتا، میں مزاج پُرسی کرتا اور علاج کی مکمل چیک اپ کرانے کی گذارش کرتا رہتا تھا۔ وہ محتاط رہتے تھے اور دوائیں بھی استعمال کرتے لیکن کہاں سے کیا گڑبڑی ہوئی کہ ۱۸؍اپریل ۲۰۰۹ء کو جب ہم لوگ دہلی میں محمد حسن سے متعلق سمینار میں جمع ہوئے۔ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان کے چہرے کا پیلا پن آواز میں لڑکھڑاہٹ دیکھ کر ہم سبھی پریشان ہوئے لیکن اس عالم میں بھی انھوں نے محمد حسن کی شخصیت اور رفاقت پر جذباتی نوعیت کی تقریر کی۔ شرکاء ان کی تقریر سے خوش ہوئے تو ان کی صحت سے فکر مند اور مغموم بھی۔۔۔ میں نے فوراً گھر واپس جانے کو کہا اور جلد از جلد باضابطہ علاج کرانے کی گذارش کی۔ میرے ہاتھ میں حسن عابد کا شعری مجموعہ تھا جو میں ان کے لئے پاکستان سے لایا تھا۔ میں نے پیش کیا تو اسے غور سے دیکھا۔ چوما اور کہا۔۔ ''میرے یار کا مجموعہ ہے اس پر تم ضرور لکھنا۔۔۔'' اس کے بعد وہ چلے گئے۔ شام کو میں نے پھر فون کیا اور سیمینار کی کامیابی کی اطلاع دی۔ آواز میں بدستور کمزوری اور لرزش تھی۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ وہ دوشنبہ کو اسپتال گئے اور بھرتی ہو گئے۔ لیکن شاید دیر ہو چکی تھی۔ پھر بھی ڈاکٹروں نے کوشش کی۔ دس دن تک وہ ICU میں رہے آکسیجن پر رکھے گئے۔ ہم سب پریشان، فکر مند اور ڈرے ہوئے۔ بالآخر ۲۹؍اپریل ۲۰۰۹ء کو رات ۹ بجے خبر آئی کہ ان کے تمام اعضائے رئیسہ نے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔

(بقیہ صفحہ 205 پر)

شخصیت

جوشِ اعظم

مجتبیٰ حسین

میں جوش صاحب پر مضمون تو کیا، ایک پوری کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ کتاب کا خاکہ مدت سے ذہن میں ہے مگر اس کو کاغذ پر منتقل کرنے کی نوبت اب تک نہیں آئی۔ میرا خیال ہے کہ جوش صاحب کی شاعری کو ایک مضمون کے ذریعے سے گرفت میں لانے کی کوشش خواہ وہ مضمون کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، زیادہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ایک مضمون میں زیادہ سے زیادہ شاعری کے کسی ایک پہلو سے بحث کی جاسکتی ہے۔ وہ بھی ادھوری، کیوں کہ یہ پہلو اُس وقت تک پوری طرح واضح نہیں کیا جاسکتا جب تک ان کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں سے ربط دے کر اسے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہ کی جائے۔

بات دراصل یہ ہے کہ جوش صاحب کی شاعری اردو کے بہت سے دوسرے شاعروں کے برعکس ایک خط مستقیم پر نہیں چلتی کہ آسانی سے اس کے فکری رخ اور ادبی محاسن کا احاطہ کرلیا جائے اور ایک یا دو مضمون کے ذریعے اس کے مجموعی تاثر اور کیفیت کو متعین کر کے پیش کردیا جائے بعض دوسرے اردو شعراء کے یہاں یہ حال نہیں ہے، مثال کے طور پر میر صاحب کی شاعری کو لیجئے۔ ان کی عشقیہ شاعری کے رخ کو آسانی سے متعین کیا جاسکتا ہے۔ اس شاعری کی دردمندی اور جذباتی شائستگی اور ادب آموزی اردو شاعری کی دولت گراں مایہ ہے۔ اس کی غم ناکی میں جو بلند کائناتی احساس ملتا ہے وہ انسانی زخموں کے لئے پھاہا ہے۔ مگر ان تمام امور سے جو ایک ہی

سلسلہ کی مختلف کڑی ہیں ایک متعینہ حد کے اندر آسانی سے بحث کی جاسکتی ہے۔ پھر میر صاحب کی شاعری کے ادبی محاسن، لہجے کی مختلف تہوں اور فنی تکمیل پر بھی جتنی چاہئے بحث کر لیجئے۔ مگر یہ تمام بحث بھی ایک ہی سمت میں ہوگی۔ نظیر اکبرآبادی کو دیکھئے۔ موضوعات کی بہتات کے باوجود وہ ایک سیدھے راستے پر چلتے ہیں اور ان کا لب ولہجہ بھی اک ہی ''کروٹ'' رکھتا ہے۔ کوئی بھی منظر ہو کوئی بھی محل و مقام ہو نظیر ہمیں وہاں ایک ہی لباس میں ملیں گے۔ یہ گیروا لباس ہے ہر ہنگامے میں شامل اور ہر ہنگامے سے جدا بلکہ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظیر اپنی شاعری میں خود تماشا اور تماشائی دونوں ہیں، اور یہی ان کے لب ولہجہ کی بھی کیفیت ہے۔ جو بے لاگ بھی ہے اور جس میں لگاوٹ بھی ہے۔ اقبال کی شاعری کو سامنے رکھیں۔ وہ ہمارے بزرگ ترین شاعروں میں ہیں۔ ان پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ لیکن اپنی تمام بزرگی کے باوجود اقبال کی شاعری کا فکری رخ متعین کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔ اقبال اور رومیؔ، اقبال اور نطشےؔ، اقبالؔ اور برگساںؔ، اقبالؔ اور گوئٹےؔ، اقبال کا نظریۂ خودی یہ تمام موضوعات بڑے وسیع ہیں لیکن یہ سب کے سب اقبالؔ کی فکر کے تحت ہی موضوع بحث بن سکتے ہیں۔ اقبالؔ کی فکر کی ایک واضح اور متعین اساس ہے۔ اس اساس کو دریافت کرنے اور سمجھنے کے بعد اس کی روشنی میں ان مختلف مسائل سے بحث کی جاسکتی ہے جنھیں اقبالؔ کی شاعری سمیٹتی رہی ہے۔ ایک مرتبے اس اساس کو سمجھ لیجئے اور ان عناصر کو جان لیجئے جن سے اقبالؔ کی فکر تشکیل پاتی ہے۔ پھر آسانی سے آپ اقبالؔ اور مذہب، اقبال اور تصوف، اقبال اور اشتراکیت کے ابواب قائم کر کے حسب توفیق لکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد اقبال کے ادبی محاسن پر شرح وسط سے بحث کی جاسکتی ہے۔ انیسؔ کے مرثیوں کو دیکھئے، موضوع واضح ہے اور فنی محاسن بھی واضح ہیں۔ صرف غالبؔ ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی فکر کے تعین میں دشواری ہوگی۔ وہ بڑی پیچ در پیچ ہے۔ اس میں مسائل تصوف بھی ملتے ہیں اور مسائلِ تصوف سے گریز بھی ہے۔ جبریہ اور قدریہ دونوں انداز پائے جاتے ہیں۔ تشکیک اور یقین دونوں 'موڈ' موجود ہیں۔ زندگی کا حوصلہ بھی ہے اور زندگی سے مایوسی بھی ہے۔ عشق بھی ہے اور فلسفۂ عشق بھی۔ دردمندی اور المناکی بھی پائی جاتی ہے، طنز وظرافت بھی ملتی ہے لہجے کی بھی

یہی کیفیت ہے۔ یہ لہجہ کبھی خالص عشقیہ غزل بن کر ابھرتا ہے، کبھی واسوخت تک پہنچ جاتا ہے۔ کبھی اس میں بلا کی سپردگی ملتی ہے اور کبھی غضب کی انانیت۔ کبھی یہ مرہم بن جاتا ہے کبھی زخم۔ اتنی متنوع اور ہمہ گیر شاعری غالب کی ہے کہ اس کا احاطہ قطعیت کے ساتھ ممکن نہیں۔ پھر بھی خدا بھلا کرے ''ظرف تنگنائے غزل'' کا جس نے بڑے جتن سے کوزے میں دریا کو بند کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں بہت سے خوردہ نویسوں کو یہ موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ ایک آدھ مضمون لکھ کر اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھیں کہ انھوں نے غالب پر بحث ختم کر دی ہے۔ حالانکہ مرزا کی شاعری اس زلف کی طرح ہے جس کے بارے میں انھوں نے خود پوچھا ہے۔

کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے؟

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ جوش صاحب کی شاعری ایسی نہیں ہے کہ اسے آسانی سے ایک مضمون میں ''طے'' کر لیا جائے۔ سیاسی، منظریہ، نظریاتی، عشقیہ، طنزیہ، ہر قسم کی شاعری ان کے یہاں آپ کو مل جائے گی۔ اسی طرح ان کا اسلوب بھی مختلف مقامات پر مختلف انداز و گفتار کا حامل ہوگا۔ کہیں اس میں انتہائی شکوہ اور جلالت ہوگی، کہیں انتہائی ــــــ سادگی اور اپنائیت، کہیں یہ تلخ اور درشت ہوگا۔ کہیں میٹھا اور نرم، کہیں یہ سرشار اور مدمست ہوگا، کہیں سنجیدہ اور نپا تلا، کبھی اس میں طنز ملے گا! کبھی دردمندی۔ کبھی اس میں فارسی ترکیبوں کی سجاوٹ اور رنگینی ہوگی، کبھی ہندی شبدوں کی معصومیت اور طہارت ہوگی۔ پھر اس میں جدید و قدیم تصورات اور نئے اور پرانے الفاظ اس بے تکلفی اور یگانگت سے ایک دوسرے کے پہلو میں ملیں گے کہ آپ کو پوری اردو شاعری ہی نہیں پوری فارسی شاعری اور ہماری تہذیبی زندگی کے مختلف مراحل کو دیکھنا ہوگا، تاکہ اس شاعری کے حسن سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔

اب آپ خیال کیجئے کہ جوش صاحب پر صرف ایک مضمون کیسے لکھا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری پر مختلف کتابیں البتہ لکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی منظریہ شاعری، ان کی سیاسی شاعری، ان کی خمریاتی شاعری، ان کی عشقیہ شاعری وغیرہ وغیرہ صرف ان کی رباعیوں کو سامنے رکھ لیجئے اور اندازہ لگائیے کہ ان پر کیا کچھ اور کتنا کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ ہماری پوری اردو اور پوری فارسی شاعری

میں مجموعی طور پر اتنی اور اتنی اچھی رباعیات نہیں لکھی گئی ہیں جتنی ہمیں جوش صاحب کے یہاں ملتی ہیں۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ رباعی کو انھوں نے اپنے شعر نواز قلم سے کیا کچھ نہیں بنا دیا۔ مختصر افسانہ، غزل، نظم، مکالمہ، ان کی وہ بے پناہ قوت جو طویل نظموں تک کی حدیں توڑ کر نکل جاتی ہے۔ جب ان چار مصرعوں میں مقید ہو جاتی ہے تو فن کی معراج بن جاتی ہے۔ چوتھا مصرعہ اُس بھرپور طاقت کے ساتھ آتا ہے جو رباعی کے فنی تکمیل کا اعجاز سمجھی جاتی ہے۔۔۔ آپ اس مصرعہ کی آواز دیر تک کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس کرتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں قصداً مثالیں دینے سے گریز کر رہا ہوں، اس لئے کہ جوش صاحب کی شاعری کے سلسلے میں اب مثالیں دے کر سمجھانا دوسرے کو بے خبر سمجھ لینا ہے۔ اور جو ان کی شاعری کو اب بھی مثالوں کے ذریعے سمجھنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ ادب و شاعری کو چھوڑ کر کسی مفید چیز کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ان کی شاعری پر بحث کرتے وقت اگر مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر دو دو مثالیں بھی دی جائیں تو ایک مجموعہ آسانی سے تیار ہو جائے گا۔ ظاہری بات ہے کہ اس کی گنجائش نہ آپ نکال سکتے ہیں نہ میں۔ ان کی ایک کتاب میں جتنی نظمیں ہیں صرف انھیں کے عنوانات اگر پیش نظر رکھ لئے جائیں تو آدمی کا دم نکل جاتا ہے۔۔۔ کتنے وسیع پیمانے پر ان کی فکر کام کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک عجیب و غریب "آنکھ" ہمیں ملتی ہے۔ جو ہر چیز کو دیکھتی رہتی ہے۔ دور ہو یا نزدیک ہو، اہم ہو یا غیر اہم ہو، خوب صورت ہو یا بد صورت ہو۔۔۔ یہ آنکھ کبھی بند ہی نہیں ہوتی۔۔۔ قافلۂ حیات تیز رفتاری سے گزرتا رہتا ہے اور ہر چند اس آنکھ کو قافلۂ حیات سے تیز رفتاری کی شکایت ہے مگر پھر بھی جس طرح اس نے دیکھا ہے اردو شاعری میں کم ہی کسی نے دیکھا ہوگا۔

غرضکہ جوش صاحب کی شاعری بڑی پہلودار، بڑی متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ اسے مختصر سی تنقید میں سمیٹنا اس کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنا اس کے مختلف ادبی محاسن سے بحث کرنا ازحد دشوار ہے غالباً اسی لئے بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ جوش صاحب کی شاعری مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان میں آپس میں کوئی ربط نہیں ہے۔ یاد ش بخیر فیض صاحب نے رسالہ آج کل میں جب وہ غیر منقسم ہندوستان میں دلی سے نکلتا تھا جوش صاحب پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں

انھوں نے یہی دکھانا چاہا تھا کہ جوش صاحب کی شاعری میں کہیں رندی ہے کہیں سیاست ہے کہیں شبابیات کا ذکر پایا جاتا ہے اس لئے ان کی شاعری ان کے خیال میں مختلف خانوں میں بٹی ہے اور ان کی شخصیت غالباً مربوط نہیں ہے۔ فیض صاحب شاید شاعری کے متنوع ہونے اور خانے میں بٹے ہونے کو ایک ہی سمجھ بیٹھے اور یوں انھیں سہو ہوا۔ بات یہ ہے کہ جوش صاحب کی شاعری اتنی staggering مبہوت کر دینے والی چیز ہے کہ آدمی اپنے خیالات کو مجتمع نہیں کر پاتا اور اپنی آسانی کی خاطر خانوں میں سوچنا شروع کر دیتا ہے ورنہ اس امر پر مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ اقبال نے اگر شکوہ لکھا تو وہ جواب شکوہ بھی لکھ سکتے تھے۔ شیکسپیئر نے اگر المیہ ڈرامے لکھے تو طربیہ ڈرامے بھی اسی کے لکھے ہوئے ہیں۔ جس گوئٹے نے عشقیہ جذبات میں شرابور چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی ہیں اسی نے فاؤسٹ بھی لکھا ہے اور ہمارے نظیر اکبر آبادی نے ریچھ کا بچہ بھی لکھا ہے اور بنجارہ نامہ بھی۔ جس طرح اس میں شک کرنے کی کوئی بات نہیں ہے کہ جوش صاحب نے خمریاتی نظمیں بھی لکھی ہیں اور سیاسی بھی، منظریہ بھی اور عشقیہ بھی اسی طرح اس میں بھی بلاوجہ شک نہ کرنا چاہئے کہ یہ ساری نظمیں ایک ہی شخص نے لکھی ہیں۔ جسے جوش کہا جاتا ہے۔ فیض صاحب کی دقت سمجھ میں آتی ہے ان کے پیش نظر غالباً ایسی نظمیں تھیں جو معمولی ہوتی ہیں اور جن کی عمر بھی نسبتاً چھوٹی ہوتی ہے۔ ان نظموں میں بیشتر زیادہ وسعت اور تنوع کی گنجائش نہیں ہوتی اور فکری رخ اور شاعرانہ شخصیت کی ایک سیدھی لکیر کھنچی نظر آتی ہے لہٰذا اس میں مربوط اور غیر مربوط شخصیت کا فرق اور امتیاز بھی بے سود ہے۔ آج کل کے مختصر صفحات میں انھوں نے بڑے خلوص سے جوش صاحب کی اس شاعری کو جو ایک پوری نصف صدی پر محیط ہے سمجھانا چاہا تھا اور اسی لئے غالباً انھوں نے خانوں والی تکنیک نکالی تھی۔ چنانچہ صہبا صاحب جب آپ نے مجھ سے جوش صاحب پر مضمون کی فرمائش کی تو میں کچھ اپنی بیماری میں مبتلا تھا اور کچھ اس قسم کی کشش و پیچ میں گرفتار تھا اب جب آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں جو مضمون کا بدل تو نہیں ہے مگر مضمون نما ضرور ہے میں اپنی ذمہ داری کچھ کم محسوس کرتا ہوں اس لئے کہ خط کی زبان تنقیدی یا قانونی نہیں ہوتی یہاں میں جوش صاحب کے مختلف پہلوؤں پر اشارے کرتا ہوا گزر سکتا ہوں۔ آپ اسے خیانت سمجھیں گے مگر یہ

خیانت آپ سے نہیں ہے اپنے خیالات سے ہے۔ میں شعروشاعری پر لکھتے ہوئے اس تن آسانی کا قائل نہیں ہوں مگر میں آپ سے پھر کہوں گا کہ جوش صاحب پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں مضمون نہیں۔ جوش صاحب کی شاعری نہ صرف پوری اردو شاعری بلکہ پوری فارسی شاعری کی بہترین اور بزرگ ترین روایت کی حامل ہے۔ اگر ہم فردوسی، خاقانی، حافظ، عرفی، نظیری، قاآنی، سودا، نظیر اکبرآبادی، غالب، انیس اور دوسرے شعرا کے انداز بیان، شعری روایات، فنی خصوصیات اور تہذیبی فضا سے واقف نہیں ہیں تو جوش صاحب کی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ ہماری سمجھ اور ہماری پسند سے باہر ہو جائے گا اور جب ہم ان تمام شعرا سے نابلد ہوکر اردو شاعری کو پرکھنے بیٹھیں گے تو نتیجہ معلوم۔ جوش صاحب کی شاعری میں یہ تمام چیزیں مجموعی طور پر ایک چیلنج کے ساتھ پائی جاتی ہیں جو اردو اور ایک حد تک فارسی کے تمام بڑے شعرا کے یہاں علاحدہ علاحدہ پائی جاتی ہیں۔ ساقی نامہ، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، مثنوی، قطعات ان تمام اصناف پر جوش صاحب نے کوئی خاص اہتمام کے ساتھ علاحدہ علاحدہ نہیں لکھا ہے۔ مگر ان تمام اصناف کا رنگ اور انداز بیان ان کی اکثر نظموں میں مل جائے گا اور بہتر سے بہتر طور پر اسے ذہن میں رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اردو شاعری کا اصل مزاج ہم نہیں پا سکیں گے۔ اس کے بعد آگے بڑھیے اور نئے زمانے میں آجایئے جہاں ماضی مٹ رہا ہے مستقبل ابھر رہا ہے۔ جاگیری دور کی اقدار ختم ہو رہی ہیں اور نیم صنعتی دور کی اقدار انتہائی کرب کے ساتھ واضح ہو رہی ہیں۔ اس دوراہے پر کھڑے ہوئے جتنے چہرے ہیں وہ آپ کو جوش صاحب کی شاعری میں نظر آجائیں گے۔ ان میں ایسے چہرے بھی ہیں جو کبھی ظریف تھے، ہنس مکھ تھے، بے فکر تھے جن کے رنگ جائداد اور زمینداری کے نشے سے چمک رہے تھے مگر اب اداس اور ویران ہیں اب ان پر افلاس کی تاریکی ہے ان میں ایسے نوجوان چہرے بھی نظر آئیں گے جن میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ ہے۔ ان میں کبھی کسی ماں کا چہرا نظر آئے گا، کبھی کسی بھائی کا، کبھی کسی بہن کا، کبھی کسی کسان کا، کبھی کسی مزدور کا، کبھی ایسی محبوبہ کا جس کی سیاہ زلفیں دیکھ کر تو کہے لیلائے شب آمادۂ پرواز ہے اور کبھی ایسی محبوبہ کا چہرا نظر آئے گا جس کی زلفیں سنہری ہیں اور جیسے سونے کا آبشار گر رہا ہے۔ غرضکہ نئے پرانے ہر قسم

کے چہرے نظر آئیں گے۔ان کی شاعری اس غیر منقسم ہندوستان کا ایک جیتا جاگتا منھ بولتا مرقع ہے جو آزادی کی راہ پر تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ بالزک کے ناولوں کی طرح جو فرانسیسی معاشرے پر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں اس شاعری میں بھی آپ کو وہ تمام کردار مل جائیں گے جو ہندوستان کی عظیم اور تاریخی سماجی ناٹک میں اپنا پارٹ ادا کر رہے تھے۔ یہاں آپ کو کمپنی کی حکومت کے گر گے شہنشاہِ معظم، گورنر، آئی. سی. ایس.، پولس کے افسر، مہاجن، ساہوکار، مل والے، طوائف، مسخرے، لفنگے، لچے، شہدے، بھوکے کسان، تھکے ہارے مزدور، سر پھرے باغی نوجوان، سیاسی پارٹیوں کے افراد، واعظ، زاہد، عورتیں، بچے، بوڑھی اور بدصورت عورتیں، ادھیڑ اور مالدار عورتیں، حسین اور نوجوان عورتیں، جامن والی، مہترانی، رانی ہر کردار مل جائیگا اور آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری شاعری واقعی کتنی بڑی، کتنی وسیع، کتنی جاندار، دلکش اور تنومند ہے اور اسے دنیا کی عظیم شاعری کے سامنے شرمانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ادب اگر تہذیب اور معاشرے کا آئینہ دار اور ناقد ہوتا تو جوش صاحب کی شاعری اس کی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے۔اس سلسلے میں ایک اور طرف بھی توجہ کرتے چلئے فرض کیجئے کہ آپ سے سوال کیا جائے کہ اردو ادب میں وہ سرزمین کہاں دکھائی دیتی ہے جس نے اسے اُگایا ہے تو آپ کیا جواب دیں گے۔ مجھے معلوم ہے چند ادھر ادھر کی باتیں کر کے لوگ گذر جائیں گے۔ مثلاً ہماری شاعری بالعموم درباری شاعری رہی ہے اس لئے غزل سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کے علاوہ ہمارا مزاج کچھ ایسا تھا کہ ہم خارجیت سے زیادہ داخلیت کی طرف مائل رہے اور ہم نے عشقیہ شاعری کی بلند تر تعبیرات پیش کی ہیں اور اسی کے آئینہ میں زندگی کو دیکھا ہے۔ مزید برآں ہماری شاعری کا ایک پہلو فکری بھی ہے۔ اور فکری شاعری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ واقعاتی یا مشاہداتی یا بیانیہ ہو۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ سہی بھی ہو سکتی ہیں، سوال اپنی شاعری کی بلندی کے منکر ہونے کا نہیں بلکہ اپنی شاعری کے اس پہلو کو دیکھنے کا ہے جس میں گوشت پوشت کے آدمی بھی ملتے ہیں لیکن یہ پہلو کمزور ہے۔ بہت کمزور ہے یہ بات نظیر اکبرآبادی سے آگے نہیں بڑھتی اور نظیر اپنی تمام خوبیوں کے باوجود قصباتی زندگی سے آگے نہیں بڑھے۔ ایسی صورت میں ہم ہندی اور

سنسکرت کے شاعروں کی طرف مڑنے لگتے ہیں جن کی شاعری میں یہاں کی دھرتی بسی ہوئی ہے، کالیداس، والمیکی، تلسی، کبیر ان کی شاعری ارضی شاعری ہے جس میں اس سرزمین کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہی پھول ہمیں جوش صاحب کی شاعری میں بھی ملتے ہیں، بیلا، چمیلی، جوہی، کیتکی، گلاب، موتیا اور ان کے علاوہ دور تک باغوں کی قطار ملتی ہے جس میں عام کے درخت میں بور آ گئے ہیں اور پوری فضا مہک رہی ہے۔ اوپر سیاہ بدمست گھنگور گھٹا گھری ہوئی ہے، نیچے مور ناچ رہے ہیں، کوئل کوک رہی ہے، پپیہے بول رہے ہیں، جھولے پڑے ہوئے ہیں، کسان کاندھوں پر ہل لے کے نکلے ہیں، کہار نیم کے نیچے ڈولی رکھ کر گا رہے ہیں۔ بہوؤں کو سسرال میں مائکے کی یاد ستا رہی ہے۔ ہجر کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ پانی ہے کہ برستا جاتا ہے۔ جی ہے کہ اڈا آتا ہے۔ دریا۔۔۔ اڈے ہوئے ہیں۔۔۔ شام کے اندھیرے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔۔ دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں میں جگنو چمک رہے ہیں۔۔۔ اور ریل سینہ تانے ہوئے۔۔۔

جہل کے سینے پہ زلفِ علم لہراتی ہوئی

ان جنگلوں سے گذرتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔۔ اس پورے ہندوستان کو اپنے قوی شانوں پر اٹھائے ہوئے جوش کی شاعری ہمارے ادب میں۔۔۔ 'اہرام مصر' کی طرح کھڑی ہوئی ہے۔

ان کی نظموں کو پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک عظیم قوت کے روبرو ہیں۔۔۔ یہ قوت کیا ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔ اس کا کوئی نام ہم متعین کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔۔۔ یہ تمام سوالات ہمیں سراسیمہ کر دیتے ہیں۔۔۔ اور ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ قوت نطق ہے۔۔۔ جس کے پیچھے قدیم اور اساسی جذبات کارفرما ہیں۔۔۔ ان جذبات کو اب تک کوئی زنجیر گرفتار نہیں کر پائی ہے۔ یہ ہر زنجیر کو توڑ کر نکل جاتے ہیں۔۔۔ جوش صاحب کے اسی نطق نے ان کی نظموں کو کہیں کہیں پر فنی تکمیل تک پہنچنے نہیں دیا ہے۔۔۔ وہ بات جہاں ختم ہو جانی چاہئے اس سے آگے بھی بڑھا دیتے ہیں۔ یا جتنے لفظوں میں ختم ہو جانی چاہئے اس سے زیادہ لفظ استعمال کر جاتے ہیں۔۔۔ مگر یہی بات تو بڑے شاعر کے یہاں پائی جاتی ہے۔۔۔ کم گوئی بہت کم شاعروں کو بڑا بنا سکی ہے۔ جوش صاحب نے جتنے اور جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں کسی اور شاعر

کو شاید یہ جرائت نہیں ہوئی۔ وہ اس معاملے میں بحرزخار ہیں۔لیکن کثرت العیالی کی طرح کثیر الفاظی بھی وبال جان بن جاتی ہے۔

جوش صاحب لفظوں پر عاشق ہیں، اور کون شاعر ہوگا جسے لفظوں سے عشق نہ ہو۔لیکن بڑا شاعر عشق کو فن بھی بنا دیتا ہے۔۔۔ جوش صاحب اس فن سے پوری طرح واقف ہیں۔لیکن جہاں وہ صرف عاشق نظر آتے ہیں وہاں ان کی شاعری بیان سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ یہ اُن کی شاعری کا کمزور پہلو بھی ہے اور توانا بھی۔ جب لفظ انھیں بہالے جاتے ہیں تو وہ بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نظمیں رواں دواں ہونے کے باوصف اس زمین کو چھوڑ دیتی ہیں جو ان کی شاعری کی سب سے بڑی قوت ہے۔اسی لئے بعض ضرورت سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ ان کی شاعری کو فکر سے خالی بتاتے ہیں۔حالانکہ ایسی شاعری جیسی جوش صاحب نے کی ہے فکر کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ جوش صاحب کی شاعری میں کوئی مخصوص فکری سمت نہیں پائی جاتی۔اور اسی لئے ان کی شاعری پر مختصر بحث بہت مشکل ہے۔جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کوئی ایسی فکر جس کا دائرہ مابعدالطبیعاتی فکر سے مل جائے ان کے ہاں نہیں۔۔۔۔ لیکن فکر سے خالی ہو کر کوئی شاعر ایسی جیتی جاگتی تصویریں نہیں پیش کر سکے گا جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

فردوسی کے شاہنامے میں کون سی فکر ملتی ہے؟ سفید دیوار خش اور سیمرغ وغیرہ میں کون سی فکر کارفرما ہے؟ شاہنامے کے اُن مشہور حصوں میں جہاں رزمیہ مناظر پیش کئے گئے ہیں کون سی فکر موجود ہے؟ شاید ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں ہم 'فکر' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔۔۔فردوسی کی فکر تہذیبی فکر ہے۔۔۔اُس کے کردار ایران کے تہذیبی کردار ہیں۔۔۔ یہ کردار آدمی بھی ہیں اور شاعری بھی ہیں۔۔۔۔ یہی تہذیبی فکر جوش صاحب کے کلام میں ہے۔۔۔ جو مابعدالطبعیاتی مسائل میں نہیں بلکہ اس برصغیر کے سینے پر چلتے پھرتے، لڑتے، جھگڑتے، عشق کرتے اور پھانسیوں کے تختے پر چڑھتے ہوئے آدمیوں کی شکل میں ملتی ہے۔

شاعری یوں بھی کی جاتی ہے کہ آدمی ایک خیال ہے، اور شاعری یوں بھی کی جاتی ہے

کہ خیال خود آدمی ہے۔۔۔ جوش صاحب کے یہاں موخرالذکر قسم کی شاعری ہے۔ وہ تصویروں میں سوچتے ہیں، اور اشاروں میں باتیں کرتے ہیں، کوئی بھی خیال ہو، کیسا ہی نازک، باریک، لطیف، غیر محسوس ہوا سے محسوس بنا دیتے ہیں۔ ان کا انداز بیان ہر چیز کو مجسم بنا دینے پر قادر ہے۔ غالبًا اردو کے کسی شاعر میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ اسی چیز نے ان کے کلام میں ڈرامائی عنصر بھی پیدا کر دیا ہے۔ جو لفظوں کے سہارے ایک منظم ڈرامائی کیفیت لے کر ابھرتا ہے۔ یہاں پہنچ کر الفاظ ان کی توانائی بن جاتے ہیں۔ کبھی وہ الفاظ کو آہستہ روی سکھاتے ہیں۔۔۔ اور یوں ایک (suspense) انتظاریہ پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی وہ تیزی کے ساتھ ان الفاظ کو حرکت میں لاتے ہیں اور یوں ایک نظم میں ایک مخصوص tempo روانی اور رواج کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ 'تعاقب' ان کی ایک نظم ہے۔ اس میں الفاظ سے انھوں نے حیرت انگیز کام لیا ہے۔۔۔ ہر لفظ پوری تیزی کے ساتھ تعاقب کرتا نظر آتا ہے۔ اور اپنی تیز روی سے ایک ڈرامائی تاثر پیدا کر دیتا ہے۔ جوش صاحب کے کلام میں عظیم الشان مجسمے کھڑے ہیں۔ جنھیں انھوں نے بڑی خوب صورتی سے الفاظ سے تراشا ہے۔۔۔ ان مجسموں میں پورا ہندوستان ڈھل گیا ہے۔ اسی لئے ان کی فکر پورے ہندوستان کی فکر ہے۔۔۔ اور ان کے کلام میں کسی ایک فکر کی تلاش بے سود ہے۔

صہبا صاحب! اُن لوگوں سے کہئے جو جوش صاحب کی فکری شاعری کا رخ متعین کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں کہ آدمی کا سامنا کریں اور زیادہ متفکر نہ ہوں۔ سب سے بڑی فکر یہی ہے۔ بعض لوگوں نے بتایا ہے کہ جوش صاحب کے یہاں جو کچھ فکر ہے وہ ایک خاص قسم کی لذتیت کی شکل میں ابھرتی ہے۔ چلئے مان لیا۔ جوش صاحب کے ہاں لذتیت ہے۔ اچھا ان کی سیاسی شاعری میں بھی لذتیت ہے؟ یہ بھی یاد رکھئے کہ ایسی نظمیں جو سیاست سے متعلق ہیں ان کے یہاں کم تعداد میں نہیں ہیں! پھر ایسی شاعری کے بارے میں کیا فرمان ہے؟ غالبًا ایسی نظمیں پھیکی اور غیر شاندارانہ ہیں اور ان میں سیاسی پختگی موجود نہیں ہے۔ جہاں تک پھیکی اور غیر شاعرانہ ہونے کا تعلق ہے اس کا ایک پہلو تو لفظ اور بیان سے ملتا ہے۔ دوسرا وہی سیاسی پختگی یا فکر کی پختگی سے ملتا ہے۔ لفظ و بیان کے ضمن میں ان نظموں کو پھیکا کہنے کے لئے غالبًا کیا یقینا بڑی قادر الکلامی

کی ضرورت ہے۔رہ گیا سیاسی پختگی والا معاملہ،اس میں پوچھنے کی بات یہ ہے کہ ملک پر کوئی بیرونی طاقت قابض ہو تو کس قسم کی فکر سے کام لیا جائے؟اس موقع پر کیا کہنا چاہئے۔اور کس طرح سوچنا چاہئے،شاعر کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔غالباً وہی ہونا چاہئے جو جوش صاحب کا تھا۔۔۔ان کی فکر عالمگیر انسانی برادری کی فکر سے جا کر مل جاتی ہے۔اچھا اسے بھی چھوڑیئے۔ان کی منظریہ نظموں میں سیاسی نظموں والی عدم پختگی نہیں ملتی؟شاید نہیں۔۔۔اب انہیں کہاں کھپایئے گا؟

اس طرح سوچتے چلے جایئے اور آپ کی فکر کو کسی منزل پر قرار نہ آئے گا۔اور آپ یہ طے نہ کر پائیں گے کہ جوش صاحب کی شاعری کے لئے کون سا نام تجویز کیا جائے؟۔۔۔اسے فکر کے کس پیمانے سے ناپیں۔۔۔ان کی شاعری میں آخر کون سی چیز پائی جاتی ہے؟۔۔۔لذتیت، نراج، الحاد، مذہبیت، سیاست، رندی، ہوس، سرمستی، لاابالی پن، جوانی کی دیوانگی، توانائی، دردمندی، انسانیت۔۔۔آخر کیا پایا جاتا ہے؟ اور آپ الجھ کر رہ جایئے گا۔جوش صاحب کی شاعری میں غالباً یہ تمام عناصر کم وبیش پائے جاتے ہیں۔۔۔اور یہی چیز ان کی شاعری کو ایک بہت بڑی شخصیت عطا کرتی ہے۔۔۔اس میں شک نہیں کہ یہ عناصر بعض اوقات آپس میں دست و گریباں بھی ہیں۔یہ کبھی کبھی متضاد رجحانات کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔مگر ہر بڑے شاعر کے کلام میں یہ متضاد عناصر ملتے ہیں۔ہم جس سماج میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ متضاد اور متصادم عناصر سے مل جل کر بنا ہے۔اس معاشرے کی اجتماعی فکر انھیں عناصر سے ترتیب پاتی ہے۔جوش صاحب کی فکر اس پورے نظام زندگی کی ترجمانی کرتی ہے جس کی وہ بیک وقت پروردہ اور نکتہ چیں ہے۔وہ ایک طرفہ اور یک رخی نہیں ہے۔۔۔وہ ہمہ گیر ہے۔۔۔وہ شاعری کی فکر ہے جو معاشرے کے ہلکے سے ہلکے ارتعاش کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔اب یہ اور بات ہے کہ ان کے کہنے کا انداز کبھی ایسا ہے کہ بڑی سے بڑی بات اولین طور پر شعر معلوم ہوتی ہے بعد میں کچھ اور۔۔۔ جوش صاحب کے کلام میں اہم ترین بات یہ ہے کہ ان کی فکر بے روح نہیں ہے۔۔۔وہ زندہ ہے اور زندہ آدمیوں کی فکر ہے جو ہر لحہ بدل رہے ہیں اور نو بہ نو تغیرات کا ساتھ دے رہے ہیں۔۔۔ اردو کے کم شاعر ہیں جنھوں نے اتنی مدت سے کہنے کے باوجود اپنے کلام کی قوت کو برقرار رکھا

ہے۔ بلکہ بڑھاتے بھی رہے ہیں۔ جوش صاحب کی شاعری میں بڑا دم ہے۔اس نے جدید فکر سے آنکھ کبھی نہیں چرائی زبان اور بیان کے جتنے تجربے، الفاظ کو نئے زاویوں اور نئی معنویت سے صرف کرنے اور مصرعوں کو تر وتازہ بنانے کی جتنی مثالیں جوش صاحب کے کلام میں ملتی ہیں وہ ہمارے پچھلے دور کی شاعری تو کیا، موجودہ دور میں بھی مفقود ہے۔ یہ تجربات جرأت فکر کے بغیر ممکن نہیں۔

جوش صاحب کی شاعری ایک طرف تو ہماری شاعری کی اعلیٰ ترین روایات کی حامل ہے۔ دوسری طرف نئے عہد کی بت شکنی کا تیز وتند جذبہ لئے ہوئے ہے۔۔۔ یہ بڑی نڈر، سرکش اور بے باک شاعری ہے۔ یہ سامنے آکر وار کرنے کی قائل ہے۔ کمیں گاہ میں دبک کر یا منہ پر نقاب ڈال کر حریف پر حملہ نہیں کرتی۔ اسی لئے بعض حضرات کی طبع نازک پر یہ شاعری گراں بھی گذر سکتی ہے۔ مگر ہمیں ان حضرات کی طرف توجہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ان لوگوں کی طرف جو کارزار حیات میں پا برہنہ ''حرف گیر و دار'' ہیں۔ جوش صاحب کی شاعری اس آدمی کے گیت گاتی ہے جو آج ایک ہاتھ پر آفتاب، دوسرے پر ماہتاب لئے مشرق و مغرب میں اُبھر رہا ہے۔

☆☆☆

''میری کتاب حیات، ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جہاں سے چاہو ورق الٹ لو، میری کتاب میں کوئی باب الاسرار موجود نہیں ہے۔''

جوشؔ

ہم نے بھی انہیں دیکھا تھا

قیصر تمکین

بیشتر قدر شناسان ادب جب کسی بلند پایہ ادیب و شاعر یا محترم المقام علمی وسماجی شخصیت سے ملتے ہیں تو فطری طور پر ان پر نہ ٹلنے والا ایک اثر ہوتا ہے حالات بدل جاتے ہیں۔ شخصیات کے توازن واہمیت میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے کبھی کبھی ملنے والا خود اتنا اہم ہو جاتا ہے کہ اپنے لڑکپن اور جوانی کے تاثرات پر اسے نظر ثانی کرنی پڑتی ہے۔اور اگر ذوق زبان سے بے نیاز ہو کر کوئی ادیب اپنے بڑوں یا ہم عصروں کے بارے میں لکھے تو اسے خود تعجب ہوتا ہے کہ وہ ممدوح کے بارے میں کتنے گمراہ کن تاثرات میں مبتلا رہا تھا یا یہ کہ وہ اس شخص کے بارے میں کن خوش فہمیوں کا اسیر تھا۔

بعض قابل قدر اصحاب مثلاً رشید احمد صدیقی ،شوکت تھانوی ،فرحت اللہ بیگ یا ماہر القادری جب شخصیات ادب فکر کے بارے میں کچھ لکھتے تو اکثر ایسی باتیں بھی کر جاتے ہیں جو برسوں تک لوگوں کو مبتلائے تحیر رکھتیں اور صداقت ان میں اتنی تیکھی ہوتی کہ اچھے اچھے تنقید نگار بھی اس عمیق فکر و گہرائی تفکر کے سامنے دنگ رہ جاتے۔اب لکھنے والوں کے نام تو یاد نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ اقبال، حسن نظامی ،مولانا دریابادی اور پریم چند کے بارے میں ہم نے ایسے خاکے پڑھے ہیں کہ لکھنے والوں کی قوت مشاہدہ اور شائستگی تحریر اور ''مثبت است بر فریدۂ عالم دوام ما'' کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

ادیبوں اور شاعروں یا فنکاروں کی متعلق اپنے تاثرات اور یادوں کا ذکر کرنے والے شوکت تھانوی کی ''شیش محل'' یا رشید احمد صدیقی کی گنجہائے گرانمایہ سے شاید ناواقف ہوتے ہیں۔ اس طرح کی کتابیں اور بھی اہل فکر لکھ گئے ہیں ان میں ماہر القادری کی تصنیف 'یادِ رفتگاں' بہت ہی قابل ذکر ہے۔ خوبی ان کتابوں کی یہ ہے کہ ان میں خود کو پس منظر میں رکھ کر صاحب قلم ممدوح کے بارے میں انشائے لطیف و طنز نظیف کے جوہر بکھیرتا ہے۔ بعض حضرات اپنا تذکرہ پڑھ کر خفا بھی ہوسکتے ہیں مگر لکھنے والا ایسی شائستگی و احتیاط سے اپنی بات کہہ جاتا ہے کہ کچہری عدالت اور لاٹھی پونگے کی نوبت نہیں آپاتی ہے۔ خود بقول رشید احمد صدیقی ''بات کہنی آتی ہو تو بات بگڑتی نہیں ہے۔''

اکثر اہل قلم اگر میرؔ و غالبؔ کے بارے میں بھی لکھیں تو اپنا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا اگر وہ قلم نہ اٹھاتے تو میر و مرزا کی شخصیت کے نادر ترین پہلو نامکمل رہ جاتے۔ حال ہی میں ہمارے فکشن کی آبرو قرۃ العین حیدر کا انتقال ہوگیا ہمارے علم میں تو کوئی ایسی عورت ہے ہی نہیں جس نے ان سے اپنی مخصوص ملاقات کا ذکر دھوم دھڑکے سے نہ کیا ہو ایک صاحبہ نے لکھا کہ عینی باجی ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں پہنے ہوتی تھیں۔ دوسری نے لکھا کہ عینی باجی سالن میں مرچ خوب کھاتی تھیں اس لئے میں نے خوب مرچوں بھرا سالن بنایا اس طرح کے مضامین سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ذکر اردو کی بے مثل ناول نگار کا نہیں بلکہ تیسرے درجے کی کسی فلمی اداکار کا ہو رہا ہو۔

ہم چونکہ ہمیشہ ہی سے اخبارات سے متعلق رہے اس لئے کسی سے ملنا بے تکلفی برتنا یا برابری سے بحث و تمحیص کرنا ہمارے لئے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں کیونکہ وہ تمام احباب جن کا اخبارات سے تعلق ہو ہماری تائید کریں گے کہ دہلی کے اخباروں میں معمولی سے معمولی رپورٹر بھی سفیروں وزیروں اور اعلیٰ افسروں سے بلا تکلف کسی وقت بھی بات چیت کرسکتا تھا۔ ہمارے اخباروں کے نمائندے وزیر اعظم کے سکریٹریٹ یا خود وزیر اعظم نہرو سے فون پر ہی بات کر کے مختلف امور پر وضاحت طلب کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عام طور پر یہ نہیں کہتے کہ میں فلاں کو جانتا ہوں یا فلاں اہم شخصیت سے میری بڑی بے تکلف جان پہچان

ہے۔ لیکن اس اظہار بے اعتنائی کے باوجود ہمیں یہ کہنے پر عار نہیں ہے کہ ہم بھی دو تین عصر آ ذیں شخصیات سے نیاز مندی کا شرف حاصل کر چکے ہیں اور اس شرف کو ہم زندگی کے اہم واقعات میں شمار کرتے ہیں۔

جس طرح ہم نے اپنی اس طویل زندگی میں دنیا کا ہر قابل دید شہر، تاریخی یادگار، نئے عجوبے یا ملک دیکھا ہے اسی طرح ہم اپنے عہد کی تقریباً ہر ممتاز علمی ادبی، سیاسی شخصیت سے بھی ملے ہیں لیکن ثبوت کے طور پر کسی عجوبۂ عالم یا علمی، سیاسی شخصیت کے ساتھ فوٹو نہیں کھنچوایا بس ایک فخر یہ ضرور رہا کہ ہمیں حضرت حسرت موہانی کو دیکھنے اور ان سے بات کرنے کا اعزاز بہت ہی بچپن میں حاصل ہوا۔

مولانا حسرت موہانی لکھنؤ کے فرنگی محل میں 'ہمدم' اخبار کے دفتر میں ایک کھری چارپائی پر لیٹے ہوئے نہیں معلوم کیا باتیں کر رہے تھے کہ ہم پہنچ گئے اور بے تکلفی سے (یعنی خاصی بدتمیزی سے) ان کو بتانے لگے کہ ہم نے ان کے بارے میں خوب پڑھا اور سنا ہے۔ فلاں رسالے میں یہ دیکھا یا فلاں ادیب نے ان کے بارے میں کیا خامہ فرسائی کی۔ مولانا اٹھ کر بیٹھ گئے اور تعجب سے ہمیں دیکھتے رہے۔ جب ہم نے ان کی مشہور ترین غزلوں کے اشعار خود ان کو سنائے تو انہوں نے مڑ کر مولانا رضا انصاری کو دیکھا (اس وقت حسرت کے پاس حضرت رضا انصاری تھے جو 'ہمدم' میں اہم تبصرہ نگار تھے۔) مولانا رضا انصاری نے ہنسکر حسرت موہانی سے کہا "یہ امیر احمد بھائی کے پوتے ہیں۔ مشیر بھائی کے صاحبزادے۔۔۔۔۔" "تب ٹھیک ہے۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر مولانا حسرت موہانی اطمینان سے دراز ہو گئے۔

حسرت موہانی ہمارے دادا امیر احمد علوی کے ساتھ رہے تھے دونوں نے ساتھ ہی بی اے پاس کیا تھا ہمارے دادا سرکاری ملازمت میں چلے گئے اور مدتوں کانپور جیسے اہم اور بڑے شہر میں سٹی مجسٹریٹ رہے۔ حکومت نے جب مولانا حسرت موہانی کا نادر کتب خانہ نیلام کرا دیا تو امیر احمد علوی نے مختلف خفیہ ذرائع سے بہت سی قیمتی کتابیں مسودے اور قلمی نسخے محفوظ کرا لئے کچھ اعزاء نے مخبری کر دی اور امیر احمد علوی کی ترقی رک گئی۔ علوی صاحب نے دل برداشتہ ہو کر قبل از

وقت پنشن لے لی اور کاکوری میں گوشہ نشین ہو گئے۔ جہاں وہ زیادہ وقت تصنیف وتالیف میں گزارتے۔

اب ہمیں بالکل نہیں یاد کہ مولانا نے کیا کہا اور ہم نے کیا سنا ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ ہم مولانا حسرت موہانی سے ملے تھے۔ دوسری بات تو بالکل ہی عجیب تھی وہ یہ کہ مولانا رضا انصاری نے اس موقع پر ہمارے والد (مشیر احمد علوی ناظر کاکوری) کی تعریف کی اور انکی خدمات کا بھی اعتراف کیا۔

فرنگی محل ہمارا ننھیال تھا وہاں کے تمام اعزا (عورت، مرد بوڑھا بچہ) ہمارے والد کے نام پر تبرا بھیجتے تھے۔ ہمیں آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ والد مرحوم میں کیا عیب یا قابل لعنت برائی تھی کہ آج بھی کوئی ننھیالی رشتہ داران کا ذکر بغیر غلیظ ترین گالیوں کے نہیں کرتا ہے۔ بہر حال رضا انصاری بھی ہمارے ننھیالی عزیز تھے مگر پورے فرنگی محل میں صرف وہی ایک ایسے شریف النفس تھے جنہوں نے والد مرحوم پر لعنت نہیں بھیجی بلکہ کئی بار ان کی تعریف میں دو تین جملے کہے۔ رضا انصاری کی محض اس خوبی کی بنا پر آج بھی ہم ان کے حق میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔

دوسری ایک اہم شخصیت امرتا پریتم کی تھی جن سے ملنے کی خوشی آج بھی تازہ ہے۔

یہ غالباً سن پچاس کے اواخر کی بات ہے جب ہم انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایش کی ایک کانفرنس کے سلسلے میں بمبئی گئے تھے، کانفرنس کے آخری دن ایک بہت بڑا اجتماع چوپاٹی میدان میں ہوا۔ رات بہت ہوگئی تھی۔ میرے خیال سے بارہ ساڑھے بارہ تو ضرور بج گئے ہوں گے۔ کانفرنس کا اختتام اس طرح ہوا کہ ان دنوں کی مشہور گلوکارہ سریندر کور نے امرتا پریتم کی نظم وارث شاہ سے خطاب سنائی۔

امرتا پریتم نے وارث شاہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ اے وارث شاہ جب پنجاب میں ایک ہیر روئی تھی تو تم نے اتنا بڑا مرثیہ لکھ دیا لیکن آج جب پنجاب کے کونے کونے میں ہزاروں ہیریں اپنی عزت وعصمت لٹائے رو رہی ہیں تو تم کہاں ہو؟

آج اکھاں وراث شاہ نوں، تو قبراں وچوں بول.........الخ

وہ بھی کیا سحر زدہ ماحول تھا ایک تو رات گئے چوپاٹی کے میدان میں ہزاروں کے خاموش مجمع کو چیرتی ہوئی ہلکی ہلکی سمندری ہوا، پھر سریندر کور کی درد بھری آواز اور امرتا پریتم کے دل سے نکلی ہوئی آہ...... یقین مانئے پورے مجمع میں ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ برصغیر میں غالباً کوئی ادب دوست ایسا نہ ہوگا جو اس نظم سے واقف نہ ہو۔ ہمارے لئے یہ نظم سننے کا پہلا اتفاق تھا۔ پنجابی شاعری کا جادو بھی پہلی بار جاگا۔ اور گو کہ نظم کے بہت سے حصے سمجھ میں نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظم آواز اور ماحول کا ایسا اثر ہوا کہ ہم اس رات بالکل سو نہیں سکے۔

اس رات کے بعد ہمارے دل دماغ پر امرتا پریتم کا ایک جادو چھا گیا۔ دہلی کے زمانہ قیام میں ہم زیادہ تر پنجابی گیت اور نظمیں سنتے خود بھی تھوڑی بہت پنجابی بولنے کی کوشش کرتے اور کسی نہ کسی طرح ہر موقع پر امرتا پریتم کی تعریف کرتے۔

ان دنوں ہم انڈین ایکسپریس سے متعلق تھے۔ وہاں ایک صاحب نے کہا کہ جب تمہیں امرتا پریتم سے اتنا ہی عشق ہے تو ان سے ملتے کیوں نہیں ہو۔

ہم نے جب معمولی آنا کانی کی اور اپنی جھوٹی سچی مشکلوں کا ذکر کیا وہ صاحب ہنسے اور کہا اچھا ہم تمہیں امرتا پریتم سے ملائیں گے۔ ان صاحب نے تھوڑے ہی دنوں بعد حوض خاص کے ایک بڑے مکان میں کہانی کی ایک شام کا اہتمام کیا جلسے کی صدارت امرتا پریتم سے کرائی اور ہمیں بھی ایک کہانی پڑھنے کی دعوت دی۔

امرتا پریتم اسٹیج سے اتر کر آئیں کہانی کے بارے میں باتیں کیں ہم سے بہت برابری اور اپنائیت کا برتاؤ کیا اور کچھ اس طرح ملیں جیسے ہم ان کے پرانے یا قریبی عزیز اور واقف کار ہوں۔ کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں اپنے گھر آنے کی بھی دعوت دی۔ ...... مگر...... ہماری اور امرتا پریتم کی یہ پہلی ملاقات ہی آخری ملاقات بھی ثابت ہوئی۔ ان دنوں دہلی میں عجیب افراتفری کا عالم تھا ہم وہاں سے براہ ممبئی لندن چلے آئے۔

حال ہی میں امرتا پریتم کے سانحۂ ارتحال کی خبر سن کر انتہائی رنج و افسوس ہوا۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ درمیانی مدت میں ہم کئی بار دہلی گئے مگر کبھی ان سے ملنے کا خیال نہ آیا۔

ہماری زندگی کی ایک قابل یادگار شام اور ملاقات پاکستان کے سفر سے متعلق ہے، ہم نے اس کا بھی ذکر بہت فخر سے اپنی ڈائری میں کیا ہے۔

یہ بات ۱۹۷۷ کی ہے جب ہم پہلی بار پاکستان گئے۔ وہاں الیکشن کی دھوم دھام تھی اور ہمارے اخبار نے ہمیں کچھ دیکھنے، سننے اور لکھنے کے لئے وہاں بھیجا۔ الیکشن میں بہت بڑے پیمانے پر بے ایمانی کی خبریں مل رہی تھیں اس لئے عام بازار اور ادارے بطور احتجاج بند تھے پی آئی اے والوں نے ہمیں ایک ایسا ٹکٹ دیدیا تا کہ ہم جس شہر یا جس پرواز سے چاہتے ملک کے کسی بھی حصے میں بلا پوچھے جا سکتے تھے۔

کراچی میں ماہنامہ افکار کے دفتر میں صہبا لکھنوی صاحب سے ہم نے کہا کہ اب ٹکٹ کرایئے یا وقت کا تو کوئی سوال نہیں ہے کیا یہ بہتر ہے کہ اسی دوران ہم حضرت جوش ملیح آبادی سے بھی مل لیں۔۔؟''۔

صہبا صاحب نے کہا کہ اگر جا سکتے ہو تو ابھی چلے جاؤ، شام کو پانچ بجے تک اسلام آباد پہنچ جاؤ گے۔ وہاں ان کے گھر پر ایک پرچہ بھجوا دینا جس پر اپنا نام اور پتہ صاف اور اردو میں لکھدینا۔ باقی (انہوں نے چٹکی بجا کر کہا......بس سم سم کھل جا......) صہبا صاحب کے کسی کرم فرما نے اپنی گاڑی پر بٹھال کر وہیں سے ہمیں ہوائی اڈے پر پہنچا دیا۔

اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر عام ہڑتال کا اثر تھا۔ دو تین ٹیکسی والے دکھائی دیئے ہم نے اس علاقے کا نام لیا جہاں جوش صاحب رہتے تھے۔ ایک ٹیکسی والا بڑا ادب دوست نکلا اور کہنے لگا جوش ملیح آبادی کے گھر جانا ہے آیئے پہنچا دوں گا۔

ان دنوں اسلام آباد ایک نسبتاً کم آباد اور چھوٹا شہر تھا ٹیکسی نے ہمیں ایک گھر کے سامنے اتار دیا جس پر اردو میں ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا جس پر بہت ہی خوبصورت نستعلیق میں لکھا تھا۔ جوش ملیح آبادی۔

ہمارے خیال میں اس بورڈ کی وجہ سے بھی آس پاس کے لوگوں کو علم تھا کہ حضرت جوش ان کے پڑوسی ہیں۔ گھر کے صدر دروازے پر یوپی کے قصباتی مکانوں کی طرح ایک ٹاٹ کا پردہ

پڑا تھا ایک خاتون کھڑا پائنچہ پہنے اور سر پر احتیاط سے گہرے ماشی رنگ کا دوپٹہ سنبھالتی ہوئی آئیں اور پوچھا کس سے ملنا ہے آپ کو؟

یہ پورا منظر ہمیں کاکوری یا ملیح آباد کی طرح کے کسی قصبے کی نقل لگ رہا تھا ہم نے کہا کیا حضرت جوش سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ انہوں نے ذرا توجہ سے ہمیں دیکھا اور پوچھا۔ کہاں سے آئے ہیں میاں آپ؟

ہمارے منہ سے نکل گیا: لندن

یہ کہہ کر ہم نے اپنے نام کا پرچہ ان خاتون کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ گھر میں چلی گئیں اور پانچ سات منٹ بعد آ کر کہا: میاں بلا رہے ہیں۔

وہ آگے آگے ہم پیچھے پیچھے ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں پہنچے جوش صاحب نے اٹھنے کی کوشش کا تاثر دیا ہم نے بڑھ کر انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ انہوں نے انتہائی شفقت اور اپنائیت سے پوچھا۔ ''لندن میں کیا کرتے ہیں آپ؟''

ہم نے کہا: اصل میں تو میں کاکوری کا ہوں خاتون نے جب پوچھا کہ کہاں سے آیا ہوں تو میں نے بیساختہ لندن کہہ دیا۔ لندن سے میرا کیا تعلق؟ کاکوری کا نام سنکر جوش صاحب اور بھی توجہ سے باتیں کرنے لگے دو تین منٹ بعد ہم نے ذرا گردن گھما کر دیکھا دو تین وضعدار اصحاب پورے بیٹھے تھے اور کاکوری و ملیح آباد کے بزرگوں کے بارے میں بڑے ادب واحترام سے جوش صاحب کے ارشادات سن رہے تھے جوش صاحب نے یہ تاثر دیا کہ ہمارے والد اور دادا کے نام ان کے لئے اجنبی نہ تھے کاکوری کے سجادہ نشین حضرت شاہ حبیب حیدر صاحب کے بارے میں بھی دو چار باتیں انہوں نے کہیں (اب یاد نہیں انہوں نے کیا فرمایا تھا)

جوش صاحب سرسری طور پر ایک آدھ جملہ مجھ سے بھی کہتے اور میرے جواب توجہ سے سماعت فرماتے۔ مجھے کچھ ایسا لگا جیسے جوش صاحب کو بولنے میں کچھ ہچکچاہٹ سی تھی ان پر ثقل سماعت کا اثر تو تھا ہی مگر بولنے میں تکلیف مجھے بہت تکلیف دہ محسوس ہوئی کیونکہ میں نے بہت لڑکپن میں انہیں لکھنؤ یونیورسٹی کے جشن سیمیں میں دیکھا تھا جہاں وہ کسی بات پر خفا ہو کر منتظمین

رہ کو خوب تفصیل سے پھٹکار رہے تھے۔

میرے پاس جو صاحب بیٹھے تھے وہ رام پور کے تھے جہاں وہ ترائی کے علاقے سے
رجے کی شیشم، صندل اور آنبوس کی لکڑی درآمد برآمد کرتے تھے۔ پاکستان ہجرت کرنے کے
ہ وہاں بھی لکڑی کی فراہمی کا کاروبار کر رہے تھے۔ انہوں نے شاہجہانپور کے ایک خدارسیدہ
وفی قسم کے پولیس افسر کا ذکر کیا۔ یہ ظاہر ہے مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ایک اور صاحب زیدی
ب تھے جو وہاں آس پاس کے علاقوں میں بہت ہی صاحب ثروت اور رئیس اعظم تھے۔
ن اور بھی لوگ تھے جو بدایوں، آگرہ اور میرٹھ سے تعلق رکھتے تھے۔ رسمی تعارف سب سے ہوا
نام ہمیں اب کسی کا بھی نہیں یاد۔

یہ لوگ جوش صاحب کو کسی شام کے لئے لینے آئے تھے جوش صاحب نے کمال یہ کیا
ہم سے کہا چلئے ہمارے ساتھ ہی...... اور بھی باتیں رہیں گی...... جو لوگ وہاں تھے وہ تو بہر حال
ز ہوئے مگر خود ہمیں یقین نہیں آرہا تھا کہ حضرت جوش (یعنی شاعر اعظم جوش ملیح آبادی) ہمیں
نے ساتھ چلنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

ہم لوگ مکان کے پچھلے دروازے سے نکلے وہاں گلی نما سڑک پر تین چار بڑی بڑی
زیاں کھڑی تھیں ہمیں جوش صاحب کے ساتھ ہی ایک لیمو کی پچھلی گدیلی نشست پر بیٹھنے کا
از ملا یہ گاڑیاں تھوڑی دور چل کر ایک ویران سی پتلی سڑک پر رک گئیں جہاں ایک کوٹھی کے
براج کا آہنی دروازہ کھلا اور دو تین آدمیوں نے بوتلوں اور گلاس کے کئی ڈبے نکال کر ہماری
ڑیوں کے بوٹ میں رکھ دئے اس کے بعد ہم ایک بالکل ہی نئے یورپی انداز کے علاقے کی
ف چلے وہاں جرمن انداز کی بڑی اور نفیس کوٹھیاں تھیں ان سب کا طرز تعمیر دیکھ کر ہمیں حیدرآباد
رنگ آباد کے نوابوں کے محلات یاد آگئے۔

ہمیں پاکستان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا اسلئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کہاں
تھے۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ شروع بہار کا زمانہ تھا چاروں طرف اتنی دلکش پر فضا پہاڑیاں اور وادیاں
میں کہ یہ سارا منظر یورپ کے حسین ترین علاقوں کی تصویر لگ رہا تھا۔

ہماری لیموجوہی کے پھول کی طرح کھلی ہوئی ایک کوٹھی میں داخل ہوئی یہ اعلیٰ وخوابناک سی کوٹھی اس طرح ایک پہاڑی کی 'نوک' پر رکھی ہوئی تھی گویا ابھی کوئی جادوئی پرندہ اسے اپنے پنجوں میں دبا کر کسی طلسماتی دنیا میں اڑا لے جائے گا۔

ہم لوگ ایک وسیع ہال میں لے جائے گئے جس پر سفید چاندنی کا فرش تھا اور جگہ جگہ انتہائی بیش قیمت قالین بچھے تھے جوش صاحب ایک ریشمی غلاف سے مزین گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے وہاں پچیس تیس افراد تھے اور سبھی جوش صاحب کی خدمت میں مصروف تھے۔ مگر معجزہ یہ تھا کہ خود جوش صاحب اس ننگِ اسلاف کو مہمان خصوصی سمجھ کر خاصی اہمیت دے رہے تھے۔ ہال میں ہر طرف اعلیٰ شیشۂ آلات کے ساتھ چاندی کے گلدانوں میں دنیا کے ہر حسین علاقے کے پھول سجے تھے صرف اس 'گلبن' کو دیکھ کر ہی نظریں خیرہ ہو رہی تھیں۔

دھیرے دھیرے محفل پر پھولوں کی خوشبو کے ساتھ ہی اعلیٰ غیر ملکی شرابوں کی خوشبو بھی پھیل گئی ایک غیر ادبی غیر ملکی' قسم کے صاحب نے ساقیٔ بزم کے طور پر نازک و منقش گلاسوں میں بہترین شرابیں پیش کرنے کا کام سنبھالا۔ خاصی ہچکچاہٹ اور تکلف کے ساتھ انہوں نے ہماری طرف بھی توجہ فرمائی (ان کے اقتباسِ طبع کا سبب غالباً یہ تھا کہ یہ کون مردود بن بلایا مہمان ان قیمتی شرابوں میں حصہ بٹانے آگیا ہے)

ہم نے گلاس نظر انداز کرتے ہوئے سر کے اشارے سے معذرت کر دی۔ وہ صاحب ایک دم چہک اٹھے چہرہ گلنار ہو گیا اور شاداب شگفتہ لہجے میں گلفشاں ہوئے۔ ارے آپ نہیں پیتے۔ ولایت میں رہتے ہیں اور پارسا ہیں۔؟ یہ کہہ کر انہوں نے چاروں طرف شرکاء کو دیکھ کر تبسم فرمایا گویا حاضرین یہ کہہ رہے ہوں کہ یہ کس ملا ٹھے کو یہاں لے آئے جو آبِ حیات سے ذوق نہیں کرتا ہے۔

جب ساقیٔ بزم نے اس محفل میں ہمیں بالکل ہی حماقت مآب ثابت کرنے کی کوشش کی تو ہم نے خاصی تیزی سے کہا اگر پیتا بھی ہوتا تو اس ماحول میں تو نہ پیتا' یہ کہہ کر ہم نے ہاتھ سے دیواروں پر لگے طغروں کتبات اور آیات الٰہی کی طرف اشارہ کیا جہاں جگہ جگہ علی فاطمہ حسن حسین

وغیرہ لکھا تھا۔

معلوم نہیں جوش صاحب نے ہماری بات اچھی طرح سنی بھی کہ نہیں مگر وہ بہر حال دیر تک چپ رہے دوسرے عمائد بھی گونگے سے ہوگئے ہمارے صرف ایک جملے نے بزم کی شگفتگی پر کچھ ایسا غیر خوشگوار اثر ڈالا کہ سب کے لہجے دھیمے ہوگئے۔ باتیں اب بھی ہورہی تھیں مگر وہ باتیں محض باتیں ہی تھیں ایک میکدۂ لرزاں ورقصاں کی شادابی مفقود ہو چکی تھی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد صاحب خانہ نے حضرت جوش کو سنبھال کر اٹھنے میں مدد کی۔ اہالی موالی بھی ساتھ چلے ہال سے قریب بنے ہوئے ڈائننگ ہال میں لانبی میز پر سلیقے سے کھانا چنا ہوا تھا۔ جوش صاحب کے سامنے ایک بھنی ہوئی ران کی قاب رکھدی گئی معلوم ہوا کہ جوش صاحب کے لئے ذاتی تقاریب میں ایک بھنی ہوئی ران ضرور ہوتی ہے۔ جوش صاحب نے ان سے کچھ ٹکڑے توڑ کر کھائے اس دوران بالکل ہی غیر رسمی ادھر ادھر کی باتیں رہیں۔ جوش صاحب ہر تین چار جملوں کے بعد پنڈت نہرو کے اخلاق، وضعداری اور شرافت کی تعریف کرتے۔ ان کے لہجے میں جو تاسف تھا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گویا جوش صاحب اپنے عزیز ترین محبوب یا عاشق سے بچھڑنے پر غمگسار ہوں۔ ہم بھی اپنی جگہ پر افسردہ یہی سوچ رہے تھے کاش جوش صاحب پاکستان ہجرت نہ کرتے۔ کاش ہندوستان اسطرح تہذیبی وسماجی طور پر تقسیم نہ ہوتا۔ کاش......

جب ہم لوگ کھانے کے بعد پہلے کمرے میں گئے تو تمام مذہبی طغرے آیات پاک اور اسماء مکرم ومقدس فریم وہاں سے ہٹائے جا چکے تھے۔

جوش صاحب کے سامنے دو تین کاپیاں رکھ دی گئیں۔ جنہیں الٹ پلٹ کر وہ اپنے کلام میں سے زیادہ تر قطعات و رُباعیات سناتے رہے۔ رات کے تقریباً گیارہ، سوا گیارہ بجے جوش صاحب نے کوئی اشارہ کیا معلوم ہوا جلد سونے کے عادی تھے۔ اس وقت وہ تھکے تھکے سے بھی لگ رہے تھے اس لئے دو تین حضرات انہیں سنبھالتے ہوئے سونے کے کمرے کی طرف لے گئے۔

جس طرح وہ سنبھل سنبھل کر ٹھٹھک ٹھٹھک کر جارہے تھے وہ دیکھ کر میں اور بھی غمزدہ

ہوگیا جوش صاحب سے ملنے کی خوشی اور اس شام میں اپنی شرکت کی واقعی خوشی تو بعد کو ہوئی جواب تک تازہ ہے لیکن اس رات میں جوش صاحب کا مقابلہ ان دنوں سے کر رہا تھا جب وہ لکھنؤ حیدر آباد الہ آباد کے مشاعروں میں رونق افروز ہوتے تھے۔ کیا رعب و دبدبہ تھا ان کا کیا شان و شوکت تھی۔ ہما شما کی تو ہمت بھی نہیں پڑتی تھی کہ ان سے براہ راست کلام کرتا۔ مولانا آزاد، ذاکر حسین، جواہر لعل نہرو کون تھا جو ان کے ناز نہیں اٹھاتا تھا۔

میری ڈائری میں اس تاریخ کے صفحے پر جوش صاحب نے ایک شعر لکھا اپنے دستخط کر دیئے۔

میں آج اپنی زندگی کی اس شام پر یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا کوئی واقعی ایسا بطل جلیل آج ہماری ادبی صفوں میں ہے جس سے مل کر ہم فخر سے یہ کہ سکیں کہ ہم نے بھی اسے دیکھا تھا۔

ایک بات اور......

جب سب دوست گاڑیوں سے نکل کر ایک گیراج میں شراب لینے گئے تو میں نے تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پوچھا: افکار کے جوش نمبر میں احتشام حسین نے لکھا ہے کہ ہٹلر کے نام اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام کے عنوان سے جو نظمیں مشہور ہوئیں وہ کسی نے خود لکھ کر آپ کے نام سے مشہور کر دیں۔ کیا وہ نظمیں آپ کی نہیں ہیں، جوش صاحب کو قدرے ثقل سماعت کی شکایت تھی اسلئے میں نے ذرا اونچی آواز میں دوبارہ استفسار کیا جوش صاحب ایک ثانئے کے لئے ٹھٹکے پھر آہستگی سے فرمایا نہیں وہ میری نہیں ہیں۔

☆☆☆

میرے بابا

سراج انور خاں

میرے نانا حضرت جوش ملیح آبادی کی صد سالہ تقریبات پیدائش کا انعقاد اس سال ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں دیگر ممالک کے علاوہ پاکستان میں بھی زور و شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہاں میرے عزیز دوست ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنے دن رات ایک کر کے ایک جامع نمبر نکالنے کی سعی کی ہے جس کے لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے لہو سے اس کی آبیاری کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے یہ مضمون لکھنے کی ترغیب دی یہی نہیں بلکہ جب میں لکھنے بیٹھا تو روز فون کر کے میری تحریر کی رفتار کو بھی ہوا دیتے رہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب مجھے اس مضمون کو لکھنے کے لیے نہ کہتے تو ان واقعات و حالات پر پردہ پڑا رہتا۔

میں نے کوشش کی ہے کہ بابا کے ساتھ بیتے ہوئے شب و روز مرحلہ وار لکھتا جاؤں یہ داستان تو کئی صفحات پر پھیل سکتی ہے لیکن میں نے اپنی یادوں سے چند اہم باتیں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں کسی حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہا ہوں۔

جوش صاحب نے اپنی اکلوتی صاحبزادی سعیدہ خاتون کے سات بیٹوں اور بیٹیوں کا تذکرہ یادوں کی برات میں کیا ہے۔ سراج انور جوش صاحب کے ساتویں نواسے ہیں کراچی میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم حاصل کی کئی برسوں سے بینک کی ملازمت میں ہیں۔ وہ اپنے نانا سے بہت نزدیک رہے جوش صاحب کی ولادت کی صد سالہ یادگار کے موقع پر (۱۹۹۶ء) میں لکھے گئے اس مضمون میں انہوں نے اپنی بعض یادوں کو یکجا کر دیا ہے۔

کبھی میں سوچتا ہوں کی اپنی تحریر کا آغاز شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی سے کرو
معاً میں نے سوچا کہ ان کے کلام پر بے شمار علما و فضلاء نے خیال آفرینی کی ہے کیوں نہ می
شروع کروں شبیر حسن خان سے جو ہمارے قابلِ فخر نانا جان تھے یعنی ان کی باتیں ان کا
ان کی حسِ مزاح ان کے برجستہ جملے ان کا اپنے چھوٹوں سے پیار و غصہ الغرض صرف ا
زندگی پر کچھ اظہار کروں۔

ہم لوگ انہیں بابا کہتے تھے چونکہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی یعنی میری والدہ مرحومہ سعیدہ
سے بہت شدت سے پیار کرتے تھے لہٰذا فطری طور پر ان کا پیار ہم لوگوں کی طرف زیادہ تھ
جب عامل کالونی نزد نیوٹاؤن میں قیام پذیر تھے ہمارا فلیٹ اس وقت صدر میں اوڈین سینم
مقابل تھا میں اور میرے بڑے بھائی فرخ جمال اپنے فلیٹ سے بابا کے گھر کے نزدیک واقع
ہائی اسکول پڑھنے آیا کرتے تھے۔ اسکول سے چھٹی ہونے پر ہمارا دوپہر کا کھانا نانا، نانی
ہوتا تھا یہ ایک معمول تھا جو برسوں چلتا رہا میری نانی مرحومہ اشرف جہاں بیگم بڑے گھر کی خا
تھیں نہایت لذیذ اور مختلف النوع ڈشیں بناتی تھیں شاید اس کی یہ وجہ بھی رہی ہو کہ بابا لذیذ کھ
کے دل دادہ تھے۔ ویک اینڈ ہم اپنی ننھیال میں گزارتے۔ شام کو بابا کے شوق کے مطابق ان
سلگایا جاتا وہ حقے کی نے منہ میں لگا کر آہستہ آہستہ کش لگاتے۔ بعض اوقات ہم بھائی بھی، از را
ان کے حقے کی نے منہ میں لگا کر ہلکا سا کش لگا لیتے تو بابا پیار بھری ڈانٹ پلا دیتے۔

وہ اکثر دورانِ شغل، بھنے چنے بہت شوق سے کھاتے۔ 'کھاتے' تو میں نے لکھا۔
وہ اس عمل کو 'ٹونگنا' کہتے، میں اور فرخ ان کے لیے چنے چھیلتے رہتے اور وہ ایک ایک دانہ 'ٹو
رہتے اور ہر دانہ دیر تک چباتے۔ بابا ہم دونوں کو حکماً یہ کہہ کر اپنے دائیں بائیں بیٹھنے کو
''ارے مصاحبو چلو بیٹھو میرے پاس'' ہم لوگ ان کے حکم کی تعمیل کرتے اور اپنی اپنی نشستیں سنبھ
لیتے۔ کبھی ہم لوگ مزاحاً کہتے کہ 'بابا ہم بھی' تو بہت لطف اندوز ہوتے، ہنستے اور معاً سنجیدہ ہو جا
اور کہتے ارے بیٹو بہت بری چیز ہے یہ اس کے پاس بھولے سے بھی نہ پھٹکنا۔

بابا، ترقی اردو بورڈ میں مشیر ادبی لغت بھی رہ چکے ہیں ان کا دفتر ان کے گھر سے نزدیک

جمشید روڈ پر تھا وہ صبح پیدل ہی اپنی چھڑی سنبھال کر اپنے دفتر روانہ ہو جاتے ہم لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد ان کے دفتر کا بھی چکر لگا لیتے جب بھی ان کے دفتر پہنچتے انہیں مشغولِ کار ہی پاتے وہ ہم دونوں کو دیکھتے ہی قلم رکھ دیتے، اپنی عینک اتار کر میز پر رکھتے اور بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کرتے اور کہتے 'ارے میرے بیٹے آ گئے، ہم باری باری ان سے گلے ملتے اور اسی دوران وہ ہم سے چھیڑ خانی کرتے اپنی گرفت ہماری گردن پر مضبوط کرتے اور اپنی شہادت کی انگلی سے ہماری پسلیوں کے نیچے گدگدی کرتے جسے برداشت کرنا ہمارے لیے مشکل ہوتا وہ اپنی اس شرارت پر بہت محظوظ ہوتے۔ پھر ہمیں بیٹھنے کو کہہ کر فوراً ہی کال بیل بجاتے اور چپراسی کو حکم صادر کرتے کہ بچوں کے لیے ٹھنڈی بوتل (کولڈ ڈرنک) لے آؤ ہماری شربت نوشی کے دوران وہ لغت کا مزید کچھ کام نمٹا ڈالتے۔ ان کے آرام کے واسطے وہاں لکڑی کا ایک تخت بھی موجود تھا جس پر گدا، تکیہ اور خصوصیت کے ساتھ دائیں بائیں گاؤ تکیے رکھے ہوتے جب وہ آرام کی غرض سے لیٹ جاتے تو ہم بھائی خاموشی کے ساتھ ان کے دفتر سے کھسک لیتے۔

۱۹۶۶ء کے اواخر میں بابا کا فیڈرل بی ایریا کا مکان تعمیر ہو چکا تھا۔ یہ ایک بلند و بالا دو منزلہ ہزار گز پر مشتمل ایک قدیم طرز کی عمارت تھی جس میں چھ بیڈ روم۔ دو اسٹور، ایک ڈرائنگ روم اور ایک ہال نماء کمرہ تھا۔ گھر کی تعمیر ہوتے ہی بابا نے ہماری والدہ صاحبہ کو صدر کا کرائے کا فلیٹ چھوڑ دینے کو کہا چونکہ نئے مکان میں بہت گنجائش تھی اس لیے ہم لوگ بابا کے نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس مکان کو مشہور آرکیٹکٹ صابر تھاریانی مرحوم نے تعمیر کیا تھا۔ تھاریانی صاحب نہ صرف ایک اچھے آرکیٹکٹ تھے بلکہ ادبی ذوق و شوق بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا وہ گجراتی میں اشعار کہا کرتے تھے اور بابا کے پاس نجی محفلوں میں شرکت سخن رہتے تھے۔

اپنے نئے گھر میں بابا، بالائی منزل میں رہتے تھے اور ہال نما کمرہ ان کی نجی محفلوں کی آماجگاہ تھا۔ اس کے پہلو میں ان کا بیڈ روم اور بیڈ روم سے متصل ان کا مطالعے کا کمرہ تھا۔ کمرہ کیا بلکہ ان کی مکمل لائبریری تھا جس میں ان کے تمام دیوان شیشے کی الماریوں میں جلوہ افروز تھے ایک روز حسب معمول' مصاحبت کے دوران میں نے حضرت فراق گورکھ پوری کے بارے میں کچھ

جاننا چاہا لیکن چونکہ میرا ابھی طالب علمی کا دور تھا میں فراق صاحب کے نام کا صحیح تلفظ نہیں ادا کر سکا اور فراؔق، گور۔کھپوری کہا، بابا پہلے 'کھپوری' کہنے پر ذرا چونکے اور مجھ سے ہنستے ہوئے کہا کہ پھر کہو کیا کہنا چاہتے ہو اب میں کچھ سمجھ چکا تھا میں یقیناً غلط بول رہا ہوں جب ہی بابا بڑے تمسخرانہ انداز میں مجھ سے بار بار ایک ہی سوال کر رہے ہیں اور یہ کہ ساتھ ساتھ ہلکے قہقہے بھی لگاتے جارہے ہیں اب میں سنبھل چکا تھا اور اپنی دانست میں درست نام لیا اور کہا کہ گور کھپوری نہیں ہوگا تو پھر 'گور' کھپوری ہوگا اس بات پر انہوں نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا اور جب بہت محظوظ ہو چکے تو پھر فراؔق صاحب کا درست نام بتایا۔اس واقعے کو آج سوچتا ہوں تو اپنی حماقت (یا بچپن کی ناسمجھی کہہ لیں) پر خود بھی بڑی ہنسی آتی ہے۔

بابا، الفاظ کو غلط ادا کرنے پر بہت برہم ہوتے اور خصوصاً اپنے اہل خانہ سے ہرگز یہ توقع نہ رکھتے کہ وہ غلط اردو بولیں گے۔مثلاً 'نظم' کو کوئی شخص 'ظ' پر زبر لگا کر بول دیتا تو وہ سختی سے ٹوکتے اور کہتے 'ظ' اور 'م' پر زبر نہ لگایا کرو 'م' ساکن پڑھو 'ٹھنڈ' سن کر چراغ پا ہو جاتے اور کہتے کہ سردی کہو یہ 'ٹھنڈ' کیا چیز ہے؟ فیلڈ مارشل ایوب خاں، جو اس وقت صدر پاکستان تھے، نے جب بابا سے کہا کہ آپ بہت بڑے 'عالم' ہیں تو بابا نے وہاں بھی تو اردو کی توہین برداشت نہیں کی اور فوراً ہی ٹوکا کہ عالَم نہیں عالِم ہوتا ہے۔ایوب خان صاحب نے اس بات کو اپنی توہین کے مترادف سمجھا اور ان کی سیمنٹ کی ایجنسی کینسل کرنے کے احکام جاری کردیے تھے۔لفظ 'مصروف' سے الرجک رہتے اور کہتے تھے لفظ مصروف، صرف کا مفعول ہے اور صرف کا مطلب ہوتا ہے خرچ ہونا کیا کوئی کام کرتے ہوئے 'خرچ' ہوتا ہے؟ ہم پھر مصروف کا متبادل لفظ جاننا چاہتے تو فوراً ہی فرماتے کہ کہو آج میں فلاں کام میں مشغول رہا۔بابا نے مروّجہ اردو کو بھی ہمیشہ رد کیا وہ لغتی زبان کو اہمیت دیتے 'وہ والا' اور 'یہ والا' بھی غلط گردانتے کہتے کہ کہو 'یہ سا' یا 'وہ سا'۔

بابا مجھے کپّی یا کالا گدون کہہ کر پکارتے تھے جب میں نے ان سے کالا گدون کی وضاحت جاننا چاہی تو وہ ہنس کر بتاتے کہ ایسا شخص جس کی گردن کالی ہو۔میں چڑتا اور جوابی حملہ کرتا اور کہتا کہ آپ ہوں گے کالے گدون، فرخ کو وہ قلندر کہتے لیکن اس کی وہ وضاحت نہیں

کرتے کہ وہ قلندر کیوں کہتے ہیں۔ یہاں میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ بابا کی محبت کہہ لیجیے یا عظمت کہ وہ کبھی ہمارے مذاق کا برا نہیں مناتے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کی بزرگی کا پاس نہ کرتے ہوں وہ مذاق کی کسی بات کا برا نہیں مانتے تھے بلکہ خوب لطف اندوز ہوتے۔

ہم لوگ کبھی کبھی بابا کو غصے میں دیکھتے تو ہمیں سانپ سونگھ جاتا خاص طور پر ہمیں ان کی آنکھوں سے بڑا خوف آتا اور ہماری سٹی گم ہو جاتی لیکن ان کے طیش کا دورانیہ چند سیکنڈوں کا ہوتا اس کے بعد وہ نارمل ہو جاتے وہ ہم دونوں سے خصوصی انسیت رکھتے تھے اگر کبھی ہمارے کسی بڑے بھائی سے زیادتی کا ارتکاب ہو جائے تو وہ ہماری شکایت پر فوری کاروائی کرتے اور ملزم کو سزا دینے میں ذرا سی تاخیر نہ کرتے۔

بابا میری والدہ صاحبہ کو زیادہ چاہتے تھے اور انہیں پیار سے کلوا کہتے والدہ صاحبہ بھی بابا کا حد درجہ خیال رکھتیں۔ بابا کی اس زیادہ چاہت کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ والدہ صاحب سخن فہم خاتون تھیں اور بابا کی شعر گوئی کے دوران، ان کا مصرعہ اٹھاتیں اور خوب داد دیتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اماں جان کہتی تھیں کہ بچپن میں وہ بابا کی بعض نظموں کو سرتال میں ڈھال کر گیت بنا کر ترنم سے گاتیں تو بابا خوب خوب جھومتے۔ بابا کی ایک نظم جس کی ابتدا اس شعر سے ہوئی تھی۔

گھٹائیں اٹھیں وہ قبلے سے کالی اموِرِ شرح کا اللہ

والی گا کر ابا کو سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے تھے بابا کی اماں سے پدرانہ شفقت کی ایک وجہ اماں کی، ان کے لیے، خدمت گزاری تھی صبح کا ناشتہ ہو یا رات کا طعام، وہ بابا کے حکم کے موجب کھانا پکاتیں اور ان کے متعین شدہ اوقات میں انہیں کھلا بھی دیتیں۔ بابا اپنے شغل سے فراغت سے ذرا مزاحیہ انداز یا شاہی انداز میں آواز میں دھمک اور گرج پیدا کر کے کہتے 'کھانا لاؤ' اماں اور ہم سب ان کی 'کھانا لاؤ' کی تعمیل میں فوراً متحرک ہو جاتے سالن گرم کیا جاتا نیچے باورچی خانے سے گرم روٹی لے کر میں بالائی منزل پر دوڑتا اور وہ گرم گرم روٹیاں کھاتے رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بابا بلا ناغہ دودھ اسپغول کھاتے۔ ان کی یہ 'ڈش' بھی احتیاط سے تیار کی جاتی کبھی دودھ

میں اسپغول زیادہ پڑ جانے کی صورت میں وہ بہت گاڑھا ہو جاتا تو بابا بہت ناک بھوں چڑھاتے اور کہتے کہ ارے یہ کیالایا ہے مردود اور بڑی بے دلی سے کھاتے۔

بابا رات کے کھانے میں ڈاک خانہ، لیاقت آباد کے سیخ کباب بہت شوق سے کھاتے تھے اور اکثر اپنے کسی نواسے کو کباب لانے کے لیے دوڑا دیتے اس سارے عمل میں کہیں بھی تاخیر ہوتی تو بڑی ڈانٹ پڑتی اور ہمیں سست و کاہل گردانتے کسی عذر کو قبول نہ کرتے اور ہمیں مزید ان کی جھڑکی برداشت کرنا پڑتی وہ ان کبابوں میں سے کچھ حصہ صبح کے لیے بچا کر رکھواتے صبح ان کبابوں کو دوبارہ فرائینگ پین پر گرم کیا جاتا اور وہ انہیں گرم پراٹھے کے ساتھ کھاتے۔ وہ گوشت کی بوٹی کو بہت آہستگی سے چباتے اور پھر میز کے نیچے بیٹھی بلی کے سامنے ڈال دیتے وہ کبھی گوشت چبا کر نگلتے نہیں تھے۔ اپنی مقرر شدہ خوراک سے ایک نوالہ بھی زیادہ نہیں کھاتے تھے دورانِ استراحت کسی قسم کے شور کو برداشت نہیں کرتے تھے ذرا سے شور سے ان کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ ہم لوگ بھی ان کی نیند کے معاملے میں بہت حساس تھے کہ کوئی بے احتیاطی نہ ہو جائے مبادہ ان کی آنکھ کھل جائے مگر لاکھ احتیاط کے باوجود کبھی زور سے کھٹ پٹ ہو جائے یا کوئی برتن فرش پر گر جائے تو وہ طیش بھری ایک 'اوہ' سنائی دیتی جس کے بعد گھر میں سب کو سانپ سونگھ جاتا۔

بابا اپنے اوقات کار کے سخت پابند تھے آنحضرتؐ کی سنت کی پیروی کرتے مثلاً بیٹھ کر پانی پینا، چھوٹے گھونٹ لیتے جنہیں وہ آہستگی سے حلق سے نیچے اتارتے، صبح تڑکے بیدار ہونا، ورزش کرنا یعنی آلتی پالتی مار کر بیٹھتے اور اپنی ہتھیلیوں پر جسم کا بوجھ ڈالتے، گن کر چہل قدمی کرتے یعنی انگلیوں کی پوروں پر اپنے قدموں کی گنتی کرتے، بلا ناغہ غسل کرتے، کم کھاتے، صبح کے دھندلکے ہی میں بالائی منزل سے نیچے آتے اپنی چھڑی کی نوک سے ہم سب کے کمروں کے دروازے کھٹکھٹاتے اور بیدار ہو جانے کی تلقین کرتے۔ لیکن ہم جو اس زمانے میں بھرپور نیند کا مزہ لے رہے ہوتے ان کے اس طرح جگانے سے بہت پریشان ہوتے مگر وہ کوئی رورعایت نہیں کرتے اور سب کے پیٹ میں چھڑی کی نوک آہستگی سے گھوپتے اور بہت محبت سے گرج دار آواز میں کہتے اٹھو منحوسو، مردودو، ہم لوگ اگر پھر بھی بنے پڑے رہتے تو جل کر کہتے کہ آدمی سوئے

ہوئے کو تو جگا سکتا ہے مگر جاگے ہوئے کو جگانا ایک مشکل امر ہے اس بات پر ہماری ہنسی چھوٹ جاتی تو خود بھی مسکراتے اور کہتے کہ بیٹے صبح بیدار ہو جانا صحت کے لیے بہت مفید ہے کیونکہ سورج نکلنے کے بعد انسان کے جسم میں مضرِ صحت خمیر پیدا ہو جاتا ہے۔ جو تمام دن طبیعت کو مضمحل اور بوجھل رکھتا ہے۔

ہمیں کبھی ناشتہ کرتے دیکھ لیتے تو فوراً پوچھتے کیا غسل کر لیا ہے! ہماری نفی پر برہم ہوتے اور جلے بھنے انداز میں کہتے کہ تو سور کھا رہا ہے اس وقت تھو ہے تیری ذات پر۔ آج ہم سوچتے ہیں کہ وہ ہمیں کتنی خوبصورت نصائح سے نوازتے تھے اور اب ہم ان کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ بابا کو باغبانی کا بھی شوق تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم ۱۹۶۷ء میں بابا کے نوتعمیر مکان میں آئے تھے تو ہمارے یہاں کچھ عرصے تک کوئی پودا نہیں لگایا گیا تھا ہماری نانی مرحومہ کے رشتے کے بہنوئی ضمیر صاحب جنہیں ہم ضمیر خالو کہتے تھے، نے ایک چنبیلی کا پودا بابا کو تحفتاً دیا تھا جسے بابا نے اپنی شام کی بیٹھک یعنی اوپری منزل کی گیلری کے عین سامنے لگوایا تھا بابا اس پودے کا بڑا خیال رکھتے اور روزانہ پانی دیتے جب اس پودے نے جھاڑی کی شکل اختیار کر لی اور اس میں پہلا پھول نکلا تو بابا کی خوشی دیدنی تھی وہ پھول توڑ کر ان کی خدمت میں لایا گیا اسے انہوں نے سونگھا اور بڑی یاس سے 'ہائے' کہا میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ یہ پھولوں کو سونگھ کر لمبی سی 'ہائے' کیوں کہتے ہیں؟ کہتے کہ بیٹے کیا بتاؤں پھولوں کی خوشبو انی کو طرح کھچ سے لگتی ہے میرا خیال ہے کہ پھول کی خوشبو سے ان کے ماضی کی کچھ حسین یادیں وابستہ تھیں۔ پودوں کی کٹائی کرنا، ان کو دھونا، اور دیر تک گھاس پودوں کی آبیاری کرنا بابا کا محبوب مشغلہ تھا انہیں پودوں اور پھولوں سے قلبی لگاؤ تھا ان کی یہ رباعی اس کی بھرپور عکاسی کرتی ہے وہ اس رباعی کو پھول سے اپنا مکالمہ کہتے تھے۔

اے گل تو کس قدر ہے شوخ و رنگیں
میں شام کو بھی آؤں گا تجھ سے ملنے
احسان ہے آپ کا یہ حرفِ تحسیں
بابا، شام کو تو میں ملنے کا نہیں

وہ پھولوں کی بے ثباتی اور کم عمری پر ملول رہتے وہ اس رباعی کو حیات انسانی پر بھی منطبق کرتے ہوئے کہتے کہ اربوں برس کی اس دنیا میں انسان کو محض بوند بھر زندگی ملی ہے۔

بابا ورزش کے خصوصی طور پر بلاناغہ عادی تھے فوجی انداز میں تیز تیز چلتے اور اگر اس دوران کسی کا سامنا ہو جائے تو اسے بتاتے کہ اتنے سو یا ہزار قدم چل چکا ہوں جوں ہی سورج سر ابھارتا اپنی دونوں ہتھیلیوں کو سر پر تاج کی طرح کھڑا کر کے سورج کو سلام کرتے اور کہتے 'بم مہاراج'۔ اس کے بعد وہ اخبار کی شہ سرخیوں کا مطالعہ کرنے تخت پر بیٹھ جاتے لیکن میں نے انہیں کبھی کسی خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا وہ شاید ورزش کے بعد ستانے کی غرض سے اخبار بینی کرتے، پھر وہ غسل کا حکم صادر کرتے سما در میں پہلے سے گرم شدہ پانی نکالا جاتا اور ان کے غسل خانے میں رکھی ایک بڑی سی ٹنکی میں پانی کا مکسچر بنایا جاتا۔ غسل کے اختتام سے ذرا پہلے نعرہ لگا دیتے کہ ناشتہ لگا دو۔

ناشتے کے بعد وہ انگریزی اخبار 'ڈان' کا مطالعہ کرتے اخبار بینی کے بعد کچھ دیر تبادلۂ خیال کرتے دوپہر کا کھانا ہرگز نہ کھاتے۔ ہم لوگوں کو دوپہر کا کھانا کھاتا دیکھ کر چڑھتے اور کہتے کہ کتے کھانا کھا رہے ہیں، وہ کھانے کی جگہ انار یا موسمی کا رس بڑی رغبت سے نوش فرماتے جس کا اہتمام بھی اماں کرتیں۔ جوس پینے کے بعد بھی وہ کُلیاں کرتے۔

بابا وقت کے سخت پابند تھے اگر ان سے کسی کو ملنا ہے یا کسی نے ملنے کا وقت دے دیا ہے اور وقت کی پابندی نہ کی جا سکی تو بہت نالاں رہتے۔

ایک دفعہ کراچی میں کل پاک بھارت مشاعرے کا انعقاد ہو رہا تھا راغبؔ صاحب اس مشاعرے کے غالباً منتظم تھے اور بابا سے ایک وقت مقررہ پر آ کر گاڑی میں لے جانے کا وعدہ کر چکے تھے اور پنڈال میں اعلان بھی کروا چکے تھے کہ جوشؔ صاحب آنے ہی والے ہیں مگر راغبؔ صاحب کو آنے میں تاخیر ہو گئی اور غالباً ڈیڑھ گھنٹے تاخیر سے پہنچے یہاں بابا کا یہ عالم کہ مشاعرے میں جانے والے کپڑے تبدیل کر کے دوبارہ بستر پر لیٹ چکے تھے راغبؔ صاحب کو دیکھتے ہی غصے سے سوال داغا کہ آپ اب آئے ہیں! راغبؔ صاحب نے۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا،

کے مصداق کوئی عذر پیش کیا مگر بابا تو سخت کبیدہ خاطر ہو چکے تھے فرمایا کہ اب نہیں جاؤں گا۔ راغب صاحب کے منہ سے بے بسی کی وہ 'اوہوہو' ہمیں آج بھی یاد ہے مگر شاید بابا کو راغب صاحب پر رحم آہی گیا اور چارو ناچار ان کی دوبارہ تیاری ہوئی اور وہ مشاعرے میں پہنچے۔

مشاعرے میں جاتے وقت ان کے ساتھ ایک ہینڈ بیگ بھی ہوتا جس میں ان کی کتاب، پڑھنے کی عینک، پان کی ڈبیہ اور چھالیہ کا بٹوہ وغیرہ رکھا جاتا۔ دوران مشاعرہ ہم دونوں ان کے قریب بیٹھے ہوتے اور بابا کی فرمائش پر ان کے منہ میں پان رکھتے، ڈلی کے دودانے اور ماچس کی تیلی سے انہیں تھوڑا سا قوام کھلاتے وہ ایک پان گال کی ایک سمت رکھتے پان کو چباتے بھی نہیں تھے۔

یہ غالباً ۱۹۷۲ء یا ۱۹۷۳ء کی بات ہے جب بابا کے ڈرائیور کی حیثیت سے میں انہیں گاڑی میں مختلف جگہوں پر لے جاتا حالانکہ بابا بھی کسی زمانے میں کار ڈرائیو کرتے رہے ہیں مگر ضعف نگاہ کے باعث اب کار ڈرائیو نہیں کر سکتے تھے۔ کار ڈرائیونگ ترک کرنے کے باوجود بابا ہمیں 'کھلا' نہیں چھوڑتے تھے ان کی نگاہ ہمیشہ مجھ پر اور ٹریفک کے بہاؤ پر مرکوز رہتی اور مختلف ہدایات دیتے رہتے۔ اس طرح وہ ہارن بار بار بجانے سے بھی منع کرتے کہتے یہ ٹریفک اصول کے خلاف ہے۔ ان کی یہ نصیحت میں آج بھی پیش نظر رکھتا ہوں کہ یہ درست ہے کہ آپ بڑی عقل مندی سے گاڑی ڈرائیو کر رہے ہیں مگر آپ ہمیشہ دوسروں سے ممکنہ حماقتوں کی توقع رکھیں اور اس بات کا مارجن رکھیں کہ نہ جانے آگے چلنے والا شخص کیا حماقت کر بیٹھے۔

ہر ویک اینڈ پر بابا کی بیٹھک سہ پہر کو منور عباس صاحب ایڈووکیٹ کے آفس واقع کچہری روڈ میں ہوتی وہاں پہنچنے سے قبل بابا اپنے مخصوص برانڈ کے قوام خریدتے۔

منور عباس صاحب باقاعدگی سے بابا کو لینے کے لیے گاڑی بھیجتے جس میں بابا اور ہم دونوں نواسے اپنی منزل مقصود تک پہنچتے۔ دفتر پر خوب محفل جمتی۔ ان کے احباب میں زیبا ردولوی صاحب قدوسی صاحب اور ایک حکیم صاحب اور بعض دوسرے حضرات شریک ہوتے زیبا صاحب کیلے اور امرود کا کچالو اپنے مخصوص انداز میں بناتے۔ کچالو بنانے کے دوران زیبا صاحب

عجیب عجیب منہ مناتے جس سے ہم اور فرخ خوب محظوظ ہوتے کچالو کھاتے جاتے اور بعد میں محفل شعر وسخن کا دور شروع ہو جاتا یہ سلسلہ شام سے پہلے اختتام تک پہنچتا بابا کو تلے ہوئے مٹر بے حد پسند تھے وہ بڑے چاؤ سے کئی کئی سیر مٹر خرید لاتے اور ہم لوگوں کو چیخ چیخ کر اپنے گرد بیٹھنے کا حکم دیتے اور پھر مٹر چھیلنے کا مقابلہ شروع ہو جاتا جس کے پاس جتنی ڈھیری جمع ہوتی وہ اتنا ہی خوش ہوتا بابا بھی اس مقابلے میں شریک رہتے عموماً یہ سارا عمل سہ پہر کو شروع ہوتا اس کے بعد مٹر گھی میں تلے جاتے اور جب بابا پیانہ بکف طلوع ہو جاتے تو ان کو 'ٹونگنے' کے لیے گرم گرم مٹر دیے جاتے وہ مٹر ٹونگنے میں ہمیں بھی پورا شریک رکھتے۔

جس شام کو ہم اپنی کسی مشغولیت کے باعث ان کے پاس نہ ہوتے تو ان پر افسوس شراب پی رہا ہوں تنہا جیسی کیفیت ہوتی وہ ہماری عدم موجودگی کا دوسری شام شکوہ کرتے۔

بابا کی اسلام آباد منتقلی سے پہلے راغب صاحب اکثر اپنے بڑے سے ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ آجاتے اور بابا سے ان کی یادوں کی برات زبانی ریکارڈ کرتے اور یہ سلسلہ ایک لمبے عرصے تک چلتا رہا والدہ صاحبہ کبھی کبھی راغب صاحب کے اس عمل پر ناگواری کا اظہار کرتیں دراصل انہیں یہ واہمہ ہوتا تھا کہ راغب صاحب یہ ریکارڈنگ اس لیے کر رہے ہیں کہ خدانخواستہ جب بابا رحلت فرما جائیں تو ان کی آواز سے فیض اٹھایا جا سکے اگر یہی عمل حکومتی اداروں کی جانب سے کیا جائے تو وہ ایک قومی اثاثہ ہوگا۔ بابا کی اس عنایت کا راغب صاحب نے یہ جواب دیا ہے کہ ان کے انتہائی نجی خطوط، جو انہوں نے راغب صاحب کو تحریر کیے تھے کتابی صورت میں چھاپ دیئے جو کہ انتہائی بددیانتی ہے۔ بابا نے وہ خطوط ان کو اپنا دیرینہ رفیق سمجھتے ہوئے لکھے تھے۔ راغب صاحب نے اس امر کی تصدیق کر دی ہے کہ انہیں جوش کے مرتبے سے کوئی غرض نہیں۔ انہوں نے محض مالی مفاد کی خاطر ان پر دانستہ یا نادانستہ کیچڑ اچھالنے کی مذموم کوشش کی ہے۔

بابا اپنی ذات میں انجمن تھے وہ ہم نواسے، نواسیوں میں بڑے رچے بسے تھے غالباً ۱۹۷۲ء میں بھٹو صاحب کی طرف سے انہیں اسلام آباد میں اعزازی مشیر ادبی لغت کے لیے دعوت دی گئی تو کچھ پس و پیش کے بعد بابا نے قبول کر لی۔

وہ جب عازم اسلام آباد ہوئے تو ہمارے لیے ایک ہولناک تنہائی چھوڑ گئے ہماری صبح شام بوجھل رہنے لگی خصوصاً شام کے وقت ہم ان کو بہت Miss کرتے کیونکہ شام کو بابا کے احباب کی آمد و رفت اور محفلِ شعر گوئی سے بڑی رونق رہتی تھی جب یہ تمام معمولات یک بہ یک منقطع ہو گئے تو ایک کاٹ کھانے والی ویرانی سے ہمارا واسطہ پڑ گیا یہی حال ادھر بابا کا بھی تھا وہ اکثر فون پر یا خطوط کے ذریعے بار بار ہمیں بھی اسلام آباد آنے کی ترغیب دیتے وہ والدہ صاحبہ پر بھی زور دیتے کہ کراچی چھوڑ کر مستقل اسلام آباد آ جاؤ مگر چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا ہاں یہ ضرور تھا کہ ہم گاہے بہ گاہے اسلام آباد جاتے اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ رہ کر 'بہ مشکل تمام' بابا سے اجازت لے کر کراچی آتے وہ ہماری روانگی سے ہفتہ بھر پہلے ہی مغموم و اداس ہو جاتے۔

بابا، صاحب حمیت شخصیت کے مالک تھے جب کافی عرصے تک بھٹو صاحب کی طرف سے انہیں ان کے فرائض منصبی نہیں سونپے گئے اور اعزازیہ دیا جاتا رہا تو ان کی طبیعت پہ یہ سب کچھ گراں بار ہونے لگا۔ لہٰذا انہوں نے بھٹو صاحب کو ایک خط لکھا کہ جس مقصد کے لیے مجھے آپ کی حکومت کی جانب سے بنگلہ اور اعزازیہ دیا جا رہا ہے وہ پورا نہیں ہو رہا لہٰذا مجھے میرا کام دیا جائے۔ اس خط کے بعد سنا ہے بابا کو لغت کا کام دیا جانے لگا تھا۔ بابا اسلام آباد کی شاموں میں ہمیشہ اداس رہتے وہ کہتے تھے کہ کراچی میں میرے احباب تھے ایک ادبی حلقہ تھا سب چھوٹ گیا اس کم بخت پیٹ کی خاطر۔

پیٹ بڑا بدکار ہے بابا پیٹ بڑا بدکار

اسلام آباد قیام کے دوران میرے بڑے بھائی پرویز شہاب (مرحوم) ان کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے اور گھر کا نظم و نسق ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا سودا سلف سے لے کر بابا کے کھانے، کپڑوں کی دھلائی تک ان کے ذمے تھی بابا وقتاً فوقتاً والدہ صاحبہ کو پرویز جنہیں وہ پرپر کہتے، کی خیریت سے مطلع کرتے رہتے۔ بابا نے پرویز کے پرپر کے علاوہ بھی نام رکھے تھے۔ مثلاً ان کی تیز افتادی کی وجہ سے بابا انہیں 'پھلو پنکھا' کہتے ان کی اعصابی تکالیف کی وجہ سے پرویز پر جو گھبراہٹ و وحشت طاری رہتی اس پر بابا نے ان کو 'وحشت کا چٹوخا' جیسے خطابات سے نوازا تھا۔

یہ بابا کی عظمت ہی کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے ادبی معاملات میں ہم سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ ہم جو ان کے سامنے ایک طفلِ مکتب، جاہل اور کم علم تھے جب یہ دیکھتے کہ ہمارے عظیم المرتبت نانا ہم سے الفاظ کے قافیے ملانے کو کہہ رہے ہیں تو ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

ایک دفعہ وہ مجھ سے اشعار کے مطالب پوچھ رہے تھے اور میں انہیں اپنی ذہنی سطح کے مطابق بتا تا جارہا تھا وہ مجھے ستائشی الفاظ سے نوازتے جارہے تھے۔ آخر میں انہوں نے مجھ سے ایک مشکل شعر کا مطلب پوچھا۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

جب میں نے اس شعر کے بھی مطلب بتادیے تو بابا نے میری والدہ، جو کہ وہیں بیٹھی تھیں کی طرف روئے سخن پھیرا اور کہا کہ 'سعیدہ! تمہارا یہ بیٹا بہت لائق ہے اتنے مشکل شعر کا بھی مطلب بتادیا' وہ دیر تک مجھے سراہتے رہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آخری دفعہ جب ہم لوگ اسلام آباد سے کراچی روانہ ہونے والے تھے تو حسبِ سابق ہم بابا سے گلے ملے، معانقہ کیا، بابا نے بہت ہی روہانسی آواز میں کہا ''بیٹے! اب کے جب تم آؤ گے تو میں نہیں ملوں گا''۔ ہائے، ان کا یہ جملہ کیسا سچ نکلا وہ اپنے وعدے کے پابند نکلے دوسری باران کے ہنستے مسکراتے چہرے کو ہم بدنصیبوں نے کفن پوش دیکھا۔ بابا چلے گئے مگر ہم سب کے جگر چھلنی کر گئے وہ ہم لوگوں سے اکثر کہتے تھے کہ میرے سارے احباب چلے گئے، ساری چڑیاں اڑ چکی ہیں نہ جانے ہم کب تک زمین پکڑے بیٹھے رہیں گے۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

یاں چھپئ دھوپ ہے، گلابی سایا — رہتا ہے سحاب ابدیت چھایا
جوش آؤ کہ منتظر ہے بزمِ ارواح — آیا، یارانِ رفتہ، آیا، آیا

☆☆☆

بابا کے شب و روز

تبسم اخلاق

ابتداً وہ مجھے پیار سے چچنی پکارا کرتے تھے۔ کیونکہ میری آواز بہت تیز تھی برسوں اسی نام سے پکارتے رہے ایک دن اچانک میرا نام چچنی سے پختوری ہوگیا اس نام کے معنی میں نہیں بتاؤں گی۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے احباب کے پوچھنے پر جب کبھی بابا اس کے معانی بتانا چاہتے تو میں انہیں روک دیتی اور کہتی اپنے احباب کو خود اس نام کے معنی ڈھونڈنے دیں۔ اور بابا کے جیتے جی ان کے احباب معنی دریافت نہ کر سکے۔ یوں تو بابا اپنے خاندان کے تمام بچوں سے یکساں محبت کرتے تھے لیکن ہم لوگوں کے اسلام آباد آنے کے بعد ان کی محبت ہم بہن بھائیوں یعنی اپنے پوتے پوتیوں کے لیے زیادہ ہوگئی۔ اور اس محبت کا اظہار وہ بھرپور انداز میں کرتے تھے۔ ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو مدنظر رکھتے۔ میں آج اپنے 'ماضی کے گودام' میں سے چند معصوم یادیں باتیں اور ان کی شفقتیں لے کر آپ کے روبرو آنسوؤں سے تر چہرہ لیے کھڑی ہوں۔

ہم لوگ برسوں بابا سے دور رہے یعنی ہم ناظم آباد والے مکان میں اور بابا فیڈرل بی ایریا کے مکان میں رہتے تھے۔ آنا جانا روز کے معمول میں شامل تھا ہم لوگ ابا کے ساتھ بابا سے ملنے جاتے تھے ایک مرتبہ میں ابا کے ساتھ بابا سے ملنے گئی بابا لکھنے پڑھنے میں مشغول تھے۔ میں کھیل کود میں مصروف ہوگئی کھیلتے ہوئے کوئی گانا گا رہی تھی جس کی تیسری لائن مجھے یاد نہیں تھی اور اسے میں گنگنا کر پورا کر رہی تھی میری آواز چونکہ بہت تیز تھی لہٰذا بابا تک پہنچ گئی۔ انہوں نے مجھے

پاس بلا کر گانا سنانے کے لیے کہا میں جھجک گئی اور کہا بابا مجھے گانا پورا نہیں آتا فرمانے لگے جس طرح اور جتنا آتا ہے وہی سناؤ، میں نے گا کر سنایا اور گانے کی تیسری لائن اسی طرح گنگنا کر پوری کی تو بابا نے ہمارے ابا کو مخاطب کر کے کہا 'سجاد تمہاری یہ لڑکی بڑی ہو کر شعر کہے گی' ان کی یہ پیش گوئی ۲۷/اکتوبر ۱۹۷۶ء کو سچ ثابت ہوئی جب میں نے ڈرتے ڈرتے بنا کچھ کہے اپنی پہلی غزل بابا کی میز پر رکھ دی انہوں نے غزل دیکھ کر پوچھا کیا تو نے کہی ہے؟ میں نے کہا جی بابا۔ فرمانے لگے اچھی ہے مشق جاری رکھو اور میرے ایک شعر پر اصلاح دیتے ہوئے کہا کہ بیٹی لفظ تبسم مذکر ہے مونث نہیں، شعر ملاحظہ فرمایئے۔

لبوں پر تبسم تھی آنکھیں تھیں نم
ہر اک درد کو ہم یوں ڈھوتے رہے

اصلاح کے بعد۔

لبوں پر تبسم تھا آنکھیں تھیں نم
ہر اِک درد کو ہائے ڈھوتے رہے

یہ میری پہلی غزل پر میرے پیارے بابا کی اصلاح تھی اس کے بعد میری ہمت بندھ گئی اور میں اپنے اشعار پر بابا سے باقاعدہ اصلاح لیتی رہی اور یوں دادا پوتی کے رشتے کے علاوہ استاد و شاگرد کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ پھر ہم لوگ ۱۱/اگست ۱۹۷۵ء کو اسلام آباد آئے۔ اس زمانے میں بابا کے مکان پر ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ معمول کے مطابق آنے والے احباب اس رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ اس زمانے میں جو احباب کثرت سے آیا کرتے تھے ان کے نام لکھ دینا ضروری سمجھتی ہوں مبادا مزید چند برسوں بعد یہ نام میرے حافظے سے محو ہو جائیں اٹک آئل کمپنی کے جناب سید اکبر نواب رضوی، کمانڈر واقف، مصطفیٰ زیدی مرحوم کے بھائی ارتضیٰ زیدی، جام نوائی کے صاحبزادے مہتاب ظفر مرحوم، جناب جام نوائی مرحوم، نظیر صدیقی، شریف الحسن مرحوم، جناب سید حفیظ الرحمٰن مرحوم، ظفر اکبر آبادی، کلام خاں، جمال خاں، پروفیسر فتح محمد ملک، راز مراد آبادی مرحوم، اختر صاحب، منظور صاحب (حسن ابدال والے)، سید ناصر جہاں مرحوم،

سید فیضی، سید سبطِ حسن رضوی مرحوم، ڈبلیو۔ زیڈ احمد مرحوم (لاہور)، جناب نظم اکبر آبادی کراچی) مرحوم، صبا اکبر آبادی (کراچی) مرحوم، پروفیسر مجتبیٰ حسین مرحوم، پروفیسر سحر انصاری، جناب عبدالخالق، عبدالرزاق مرحوم (ٹوبیکو کمپنی والے)، پروفیسر مقصود جعفری، جناب سید عارف، جناب فرمان فتح پوری، میر علی احمد خان تالپور، رئیس امروہوی مرحوم، جناب قتیل شفائی، جناب فیض احمد فیض مرحوم، احمد فراز، احمد ہاشمی، جناب سرور بارہ بنکوی، مولانا کوثر نیازی صاحب مرحوم کا مکان بہت قریب تھا۔ لہٰذا حکومتی امور سے ان کو جب بھی فراغت ہوتی وہ اپنی محبت اور عقیدت کے اظہار کے طور پر اکثر بابا سے ملنے آتے (یاد رہے کہ اسلام آباد میں جناب جوش کی ملازمت اور دیگر امور کے سلسلے میں مولانا کوثر نیازی صاحب کی خدمات گراں قدر ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا) پیر صاحب دیول شریف، نصیر الدین نصیر گولڑہ شریف والے شام سے قبل ہی بابا کا دربار لگ جاتا، احباب ایک ایک کرکے آنا شروع ہوتے بابا نہادھوکر سفید کرتے پائجامے میں تروتازہ چہرہ لیے احباب کے ساتھ محفل سجاتے کبھی ادب پر گفتگو ہو رہی ہے تو کبھی لطیفے بازی کا دور چل رہا ہے۔ اکثر و بیشتر احباب گفتگو کے اختتام پر بطور خاص بابا سے کلام سنانے کی فرمائشیں کرتے بابا سناتے لوگ محظوظ ہوتے اور رات گئے تک یہ سماں بندھا رہتا۔

اور پھر یوں ہوا کہ اچانک ہی سماں تبدیل ہوگیا غالباً ۱۹۷۸ء کے اواخر میں اخبار جنگ راولپنڈی میں یہ خبر پڑھی کہ 'جوش ملیح آبادی کو بلیک لسٹ کر دیا گیا'۔ مارشل لاء کا دور تو یوں بھی بڑا پر' آشوب تھا اور جوش صاحب پر جلد یا بدیر قیامت ٹوٹنا ہی تھی سو وہ قیامت کی گھڑی آن پہنچی اخبارات، رسائل، جریدے، مراسلے جوش کے خلاف زہر اگلنے لگے گویا زلزلہ اتنا شدید تھا کہ زمین لاوہ اگلنے لگی بابا تو ان باتوں کے عادی تھے مخالف سمت سے آنے والے ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں تیر اپنے سینے پہ سہہ لیتے تھے۔ لیکن اب وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکے تھے جہاں انسان کو ضرورت سے زیادہ پیار اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے اور بابا کو یہ پیار اور خلوص ان کے احباب ہی دے سکتے تھے۔ مگر میں نہایت معذرت کے ساتھ یہ بات تحریر کر رہی ہوں کہ جوش صاحب کے برسوں پرانے احباب نے مالی تو کجا اخلاقی مدد بھی نہیں کی آندھیوں کی زد پر تھرتھرانے

والے اس چراغ کو کسی نے ہاتھوں کی آڑ دے کر بجھنے سے روکنے کی کوشش نہیں کی یہ چراغ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر زندگی کے بقیہ چار دنوں سے بھی جنگ لڑتا رہا اور آخر کار ۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء کو پونے چار بجے صبح گل ہوگیا۔ اس پُر آشوب دور میں احباب کی آمد ورفت بہت کم ہوگئی تھی بلکہ آخر میں تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن جو احباب ان سے حقیقتاً محبت کرتے تھے وہ اسلام آباد آنے پر بابا سے ضرور ملتے تھے۔ وہی راغب صاحب جو جوش صاحب کے مداحین میں خود کو شمار کرتے اس زمانے میں نہ تو ان کا خط آتا تھا نہ ٹیلی فون بلکہ جوش صاحب فرطِ محبت میں انہیں خود فون کرتے تھے۔ راغب صاحب نے مکالمہ مابین جوش راغب اور ان کے سنسر کیے جانے والے خطوط چھاپ کر جوش صاحب کو پاکستان بھر کے لیے ناپسندیدہ بنانے کی کوشش کی۔

کوئی بھی جوش صاحب کی تنہائی بانٹنے والا نہیں تھا۔ سوائے جناب سید حفیظ الرحمٰن کے، حفیظ صاحب جوش صاحب کی زندگی کے آخری دنوں تک دم ساز وغم گسار رہے جناب حفیظ نگینے کے رہنے والے تھے۔ بلند قد وقامت گورا چٹا رنگ، علم وادب پر اچھی اور نفیس گفتگو کرتے تھے۔ میں چونکہ جوش صاحب کے بیشتر امور کی ذمے دار اور نگراں تھی لہٰذا مجھے وہ پیار سے منسٹر صاحب کہا کرتے تھے اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ یاد رہے کہ یہ مارشل لاء کا زمانہ تھا جوش صاحب بلیک لسٹ قرار دے دیئے گئے تھے شراب پر پابندی عائد تھی ایسے عالم میں جب جوش صاحب تنہائی کا شکار تھے احباب ایک ایک کر کے غائب ہو چکے تھے جناب حفیظ الرحمٰن صاحب کی محبت اور غمگساری یقیناً قابلِ صد احترام تھی وہی کام آئے۔ حفیظ صاحب کے سلسلے کی آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ جس وقت بابا کومے میں چلے گئے تھے اور کسی کی آواز کا جواب بھی نہیں دے سکتے تھے میری موجودگی میں ہی جب حفیظ صاحب نے بابا کو آواز دی کہ جوش صاحب! جوش صاحب! آنکھیں کھولیے دیکھیے آپ کا حفیظ آیا ہے تو نہ صرف یہ کہ بابا نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا بلکہ ان کے ہاتھ کو اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر اپنی محبت اور شناسائی کے اظہار کے طور پر دبایا بھی حفیظ صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے اور کہا جوش صاحب آپ اپنے حفیظ کو تنہا چھوڑ کر نہ جائیے یہ کہہ کر وہ ہچکیاں لے کر رونے لگے ہم سب بھی بہت روئے۔ ایک قیامت تھی محشر کا دن تھا

جو ہم گھر والوں پر بیتا آج بھی اپنے بابا کی آخری اکھڑی اکھڑی سانسیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر کبھی اپنے بابا کے نرم و گداز ہاتھوں کو چومتی، کبھی ان کے پیروں پر اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ رکھ دیتی اور کبھی بابا کے قریب جا کر ان کو آوازیں دیتی بابا! خدا کے لیے کچھ تو بولیں، ہسپتال میں بابا کے کمرے سے باہر رپورٹروں کا جمگھٹا تھا ٹی وی کیمرے والوں کو لے کر عون محمد رضوی ان کی بے کسی کی فلم بنانا چاہتے تھے میں حکومت اور حکومت کے اداروں سے سخت نالاں تھی لہٰذا میں نے نہایت سختی اور برہمی کے ساتھ ٹی وی والوں کو لوٹا دیا میں نہیں چاہتی تھی کہ برطانوی سامراج کو گھن گرج کے ساتھ للکارنے والا، ہر حکومت سے بلا خوف و جھجک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والے جوش اس کسمپرسی کے عالم میں لوگوں کے سامنے آئیں۔

موت برحق ہے ایک نہ ایک دن سب کو آئے گی لیکن ایک تاریخی حقیقت بیان کر دوں کہ ماہر امراض قلب ڈاکٹر شوکت ملک (پولی کلینک اسلام آباد) بابا کے معالج کے طور پر انہیں دیکھنے اکثر گھر پر آیا کرتے تھے۔ جس دن ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ڈاکٹر شوکت ملک نے گھر آ کر دیکھنے کے بعد انہیں فوراً ہسپتال میں داخل کرانے کو کہا۔ بابا کے ہسپتال میں داخل ہونے کے چار دن بعد تک ہمیں ڈاکٹر شوکت ملک ہسپتال میں نظر نہیں آئے۔ جب حالت زیادہ بگڑنے لگی اور کوئی صورت سنبھلنے کی نظر نہیں آ رہی تھی تو میں نے حیدر آباد سندھ میں جناب میر علی احمد خان تالپور کو فون کر کے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا اور ہسپتال والوں کے رویّے کے بارے میں بتایا اسی دن شام کو میر صاحب کے کہنے پر بریگیڈیئر ذوالفقار سی۔ ایم۔ ایچ۔ سے خاص طور پر جوش صاحب کے لیے پولی کلینک آئے ڈاکٹروں کی کارگزاری دیکھ کر فوراً شوکت ملک کو بلوایا اور شیشوں والے کمرے میں ہم سب کے سامنے شوکت ملک کو بری طرح ڈانٹا پھٹکارا کہ آپ لوگوں نے بالکل غلط Treatment دیا ہے شوکت ملک برابر ہاتھ جوڑ جوڑ کر بریگیڈیئر ذوالفقار صاحب سے اپنی کوتاہی کی معافی مانگ رہے تھے لیکن بھلا ان معافیوں سے کیا ہمارے بابا ہمیں واپس مل جاتے اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سب نادانستہ ہوا یا عملاً جوش صاحب کو ختم کرنے کے لیے ایسا

کیا گیا؟اور بقول جوش۔

کہوں کس سے میں یہ جا کر مری قوم بدگلو نے
مجھے قتل کردیا ہے بہ گناہ خوش نوائی

بابا آپ اگلے جہاں میں ہیں جہاں ہم سب کو ایک نہ ایک دن ضرور آنا ہے لیکن آپ کی جدائی کا زخم اتنا کاری ہے کہ آج تک خود کو مکمل طور پر نہیں سنبھال سکی ہوں مجھے آپ کا وہ پیار سے 'پختوری' کہہ کر بلانا مجھ سے ڈھیروں باتیں کرنا، آپ کی دلجوئی کرنے سے جو طمانیت مجھے محسوس ہوتی تھی وہ بیان سے باہر تھی۔ کالج سے میری واپسی کا انتظار کرنا اور پھر میرے آنے پر یہ کہنا کہ 'پختوری' تم آئی ہو تو دل ذرا سنبھل گیا ہے بہت ہی گھبرا رہا تھا' کاش کہ میں زندگی بھر آپ کے قدموں میں بیٹھی رہتی لیکن آپ ہی نے مجھ سے منہ موڑ لیا اب میں اپنے بابا کو کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں؟

☆☆☆

آئی بوئے دوستی فطرت کے ساماں سے مجھے
لینے آئی اک مہک صحنِ گلستاں سے مجھے

جوشؔ

اطراف وجہات

اقبال حیدر

یوں تو جوش کی شاعرانہ حیثیت سے کون واقف نہیں اور ان کی عظمت اور لامحدودیت کا کون علم دوست انسان قائل نہیں۔ لیکن جب جوش کا ذکر آتا ہے تو پھر بات یادوں کی برات تک محدود ہو جاتی ہے اور یادوں کی برات کے سلسلے میں بھی سارا زور بیان اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ جوش نے کتنی غلط بیانی کی ہے۔ کتنا غلو کیا ہے یا کتنی خودستائی کی ہے یعنی گفتگو کا محور فن نہیں رہتا بلکہ ایک دستاویزی شکل اختیار کر لیتا ہے چلئے اس میں کوئی حرج نہیں تھا اگر چیزیں معروضی انداز سے جاتیں مگر شاید ایسا ممکن نہیں رہتا۔ ادھر چند سالوں میں کچھ بہت اچھے مضامین یادوں کی برات کے سلسلے میں آئے۔ جوش کی انشاپردازی، خاکہ نویسی، زبان کا تخلیقی استعمال اور طرز بیان کی تحریک خصوصی طور پر زیر بحث آئی دیکھئے اس سلسلے میں چند باتیں بہت اہم ہیں۔ اول تو یہ کہ یادوں کی برات تو جوش کے آخر عمر کی تصنیف ہے اور جوش نے ساری عمر نثر لکھی ہے۔ اداریئے لکھے ہیں۔ مضامین لکھے ہیں، اخباروں کے کالم لکھے ہیں، ادبی تبصرے لکھے ہیں۔ غرض انہوں نے شاعری کے ساتھ تمام زندگی نثر لکھی اور ان کا پہلا نثری مجموعہ اشارات ۱۹۴۲ء میں چھپا تھا۔ دوسرے یہ کہ جوش کی آپ بیتی اردو کی پہلی ایسی آپ بیتی ہے جس میں بے تکلفی اور بے باکی سے گفتگو کی گئی ہے۔ اردو میں یوں بھی آپ بیتی کا رواج بہت نہیں رہا ہے اور خصوصاً اس نوعیت کا تو بالکل بھی نہیں۔ تیسرے یہ کہ جوش نے اگر غلط بیانی کی بھی ہے اور مبالغہ آرائی سے کام لیا بھی ہے تو یہ اردو ادب میں پہلی بار تو نہیں ہوا ہے۔ غالب کی مثال سامنے ہے دستنبو ہے، قاطع برہان ہے،

درفش کاویانی ہے، سرسید کے آئین اکبری کا جواب ہے۔ یہ سب بڑی متنازع تصانیف رہی ہیں اور غالب پر خوب خوب الزام لگے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ ایسا کرنا ٹھیک تھا یا ہے صرف بات اتنی سی ہے کہ شخصی کمزوریوں سے کوئی مبّرا نہیں ہے۔ یوں بھی ہمارے یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے اگر مغربی ادب اور سماجی سائنس کے اکابرین کو دیکھیں تو ہم کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔ چاہے کیٹس ہوں، شیلی ہوں یا بائرَن اگر ان کو عام اخلاقی معیار اور زاویوں سے دیکھا جائیگا تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جائیگی۔ اور پھر دنیا کی بہترین سوانح میں روسو کی Confession کا شمار ہوتا ہے۔ اس کتاب کا تو نام ہی اعتراف سے مختص ہے مگر دیکھئے روسو نے کیسی مہارت سے اپنی آخری زندگی کے کڑوے سچ کو چھپایا ہے۔ چوتھے یہ کہ کچھ لوگ ابھی بھی ہیں جنھوں نے جوش کا زمانہ اور جوش کو دیکھا تھا۔ ان کو یادوں کی برات میں ایسی ناقابل یقین باتیں نہیں نظر آئیں ہاں اختلافات ضرور ہیں تحفظات بھی ہیں۔ میر انشاء جوش کا دفاع کرنا نہیں ہے صرف چیزوں کو ان کے جائز (Perspective) میں رکھنا ہے۔ میں نے کچھ باتوں کی تصدیق خورشید علی خان صاحب، ڈاکٹر محمد حسن، راغب مراد آبادی، گلزار دہلوی سے سنی یا ان کے حوالے سے سنی ہے۔ بہت سی باتیں غلط بھی کہی جاسکتی ہیں مگر ایسا نہیں ہے کہ محض واقعاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کتاب درخور اعتنانہ قرار پائے، انشاپردازی اور اسلوب سے تو آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ پانچویں یہ کہ Reality (حقیقت) اور Perception (تجسس) کے تفاوت میں ایک طلسماتی روا اور بڑی کرشمہ سازی ہوتی ہے اور یہی سچ اور جھوٹ کے درمیان کا وسیع تر حصہ ہے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں صدق (Truth) اور تمثیل صدق (Perceived Truth) کا فرق کہا جاسکتا ہے۔ ایک مجرد سچ ہے اور دوسرا وہ جو وصول کرنے والے کے درک پر وارد ہوا۔ میں نفسیات کے حوالے سے اس چیز کو ضرور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب بھی کسی بہت ہی طویل دورانیہ کا احاطہ کیا جائے اور وہ بھی اس کے مرکزی کردار کے قلم سے تو یہ امکانات بوجوہ حقیقت بن جاتے ہیں۔

چھٹی اور آخری بات جو یادوں کی برات کے سلسلے میں اہم ہے وہ ''غایتِ تصنیف'' ہے دیکھیں جوش کے تمام کلام ان کی شخصیت کے ہر گوشے اور اُن کی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ اس

بات کو ثابت کرتا ہے کہ یہاں کوئی باب اسرار نہیں ہے بلکہ ہمارے معاشرے میں جو شدید اور مروج منافقت ہے وہ اس سے بہت برگشتہ رہے ہیں اور اسی کے رد عمل میں ان کے یہاں بعض ایسے عوامل ور جحانات جگہ پا گئے ہیں جو ان کے لہجے اور مواد میں کبھی کبھی غیر سنجیدہ حد تک تجاوز پیدا کر دیتے ہیں بلکہ اس سے ان کے فکری اساس اور مرتبے کو نقصان بھی پہنچا ہے۔ بہر حال یہ ''ناگفتنی'' کو گفتنی بنانے کا جو بیڑا انہوں نے اٹھایا تھا میرے نزدیک یادوں کی برات اسی خواہش کی تکمیل ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ بڑی حد تک ایک کامیاب کوشش ہے۔ جہاں جوش نے بارہا اپنی شاعری سے جمود توڑا ہے وہیں یادوں کی برات لکھ کر اردو کے نثری ادب ہی میں اضافہ کیا ہے۔ جہاں لوگ صدیوں سے دل میں زبان چھپائے زندہ ہوں وہاں حرف برہنہ ایک نعمت اور دریدہ دہنی ایک خدمت سمجھی جانی چاہئے۔

یہاں تک تو بات تھی یادوں کی برات کی ساکھ اور معتبریت کے حوالے سے اس مضمون کے آخر میں اس کتاب کی حیرت انگیز و بے مثل انشا پردازی پر بھی گفتگو ہوگی۔ ابھی یہ دیکھنا ہے کہ جوش کی دیگر نثری تصانیف کا منشا اور انداز کیا تھا۔ کیا ان میں بھی وہی تنوع اور سانس لیتی جیتی جاگتی زندگی کی حشر سامانیاں تھیں کیا وہاں بھی جوش کہتے نظر آ رہے تھے۔

درمیان تحت وفوق و بحر و بر
صرف اک انساں ہے جنسِ معتبر

آیئے دیکھتے ہیں۔ جوش کا ایک نثری مجموعہ ۱۹۴۲ء میں ''اشارات'' کے نام سے چھپا تھا جس کی دوبارہ اشاعت ۲۰۰۱ء میں ادارۂ نیا سفر اور جوش لٹریری سوسائٹی کنیڈا نے کی اس کتاب میں بیشتر اُن اداریوں کو جمع کیا گیا ہے جو جوش نے رسالہ کلیم میں لکھے تھے۔ کچھ متفرق مضامین اور بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے بڑی کاوش اور عرق ریزی کے بعد جوش کے وہ مضامین بھی جمع کئے ہیں جو گزشتہ صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں جنگ میں شائع ہوئے تھے۔ امید ہے عنقریب وہ کتاب بھی منظر عام پر آ جائے گی اشارات کے صرف عنوانات ہی کو آپ دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جوش کس قدر چوکھی لڑ رہے تھے۔ ظاہر ہے وہی ہوا جو ہونا چاہئے

تھا یعنی دشمنوں کی اور دشمن گروں کی فہرست طویل سے طویل تر ہوتی گئی۔ انداز بیان اکثر درشت ہے مگر مضامین اور تحریر سے جوش کی سماجی حیثیت اور عصری آگہی عیاں ہے۔

امرائے ہند، سیاسی انجمنیں، ایک سوال، تمہارے پیر، ہمارے مجتہد، عصر حاضر کے ہلاکو اور ان کے مقتول، اودھ کے زمیندار اور تعلقدار، نشہ اور بنی نوع انسان، قومیت کا تخیل، ہندوستانی پردہ، بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت، ایک مکالمہ اور ہمہ دانی، ان میں سے بیشتر مضامین کی زبان صحافیانہ اور طرز استدلال بہت منطقی ہے۔ جہاں ضرورت پڑی ہے دیگر مقدس کتابوں اور قرآن کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ دوٹوک بات اور برہنہ گفتاری بھی ہے اور بے شمار ایسے موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے جن پر عام طور پر نہ زبان چلتی ہے نہ قلم۔ اب اگر وہ دور دیکھیں، ملک تقسیم ہونے کو ہے، ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں، کشیدگی کا سورج نصف النہار پہ ہے، مسلمانوں کی وطنیت مشتبہ ہو چکی ہے، سرحد کے دونوں طرف بے وطنیت کا احساس کارفرما ہے اور جوش بہر حال مسلمان ہیں عقائد کے لحاظ سے نہ سہی مگر سماجی اعتبار سے تو ہیں ہی۔ مگر دیکھئے کتنی ہمت اور جرأت سے انتہائی حساس عنوانات پر لکھ رہے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ یہ مسائل آج بھی ویسے ہی ہیں، یہ عنوانات آج بھی relevant ہیں مگر کوئی ایسا Non-Partisan نیز جانبدار لکھنے والا نہیں جن کے قلم کی حرمت اور فکری دیانت کے سب قائل ہوں۔ اگر دونوں طرف نہیں تو اپنے اپنے ملکوں ہی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے کہ جن کہ غیر جانب داری مسلم ہوتی۔

جوش نے اس کتاب میں جو مضمون پردے اور ہندوستانی قومیت یا نثر کے حوالے سے لکھا ہے وہ بہت اہم نکات اٹھاتا ہے مثلاً ''مسلمانوں خدا لگتی کہنا کیا تم اپنے کو خدا اور اپنے رسول دونوں سے زیادہ غیرت مند نہیں سمجھتے، ایک دم سے بھڑک نہ اٹھو، بے سمجھے بوجھے مشتعل نہ ہو۔ دوسروں کی باتیں صبر کے ساتھ سننے کی عادت ڈالو۔ یقین مانو ہر وہ بات جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو، لازمی نہیں کہ ہمیشہ غلط ہی ہو۔ بات سنتے ہی جامے سے باہر ہو جانا آدمی کے لئے زیبا نہیں یہ روش تو یادش بخیر اس عہد کی یادگار ہے جب ہمارے اجداد جنگلوں میں رہا کرتے تھے''۔

کیا تم نے اپنی کتاب کے آیات حجاب کا مطالعہ خود کیا ہے یا اپنے محلّے کی مسجد کے بڑے مولوی صاحب ہی کے ارشادات عالی پر عمل پیرا ہو؟

''مسلمانوں! میں سفارش کرتا ہوں کہ برائے خدا اور رسول تم قرآن حکیم کی سورہ نساء نواز اور احزاب کا خود مطالعہ کرو۔ اور جیسا کہ خود تم سے قرآن بار بار مطالبہ کرتا ہے۔ ''تدبر و تفکر سے مطالعہ کرو''۔

آپ نے دیکھا کہ بات کتنی سوا سولہ آنے ہے اسی طرح ایک اور مضمون میں جوش ہندوستانی قومیت اور ہندو مسلم تقسیم پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اس اشتعال انگیز اور غیر انسانی رویے کا حل صرف اور صرف مکمل اختلاط (integration) میں ہے اور اس نکتے کو وہ کسی بھی پہلو یا امکان سے تشنہ نہیں چھوڑتے۔ یہ آج سے ۶۵، ۷۰ برس پہلے کی بات ہے اور سماجیات کی ان باریکیوں پر نظر رکھنا اور پھر ان کو کھل کے بیان کر دینا جوش ہی کا حق تھا۔ کاش ہم نے مختلف تعصبات اور مفادات میں گھر کے اور جوش کی کوتاہیوں کو عذر بنا کر انہیں تج نہ دیا ہو یا جوش جیسے سماجی باغی، زیرک مفکر اور نڈر دانش ور کی جتنی ضرورت ہماری سوسائٹی کو رہی ہے اور ہے شاید کسی اور سماج کو نہ رہی ہو۔ جوش کی یہی افادیت اور relevance ہی تو ہے جو ہم جیسوں کو ان کے در سے ہٹنے نہیں دیتی۔

اس موقع پر میں ایک ایسی بات کہنے کی جسارت کروں گا جس کا ہمارے یہاں بالکل فیشن نہیں ہے اور شاید جو کچھ لوگوں کو خفا بھی کر دے۔ اور اس بات کا شاعری یا نثر سے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق اس سلسلۂ دانش سے ہے جسکا رشتہ بڑی حد تک ٹوٹ چکا ہے۔ ایسا ہے کہ جو بھی ذہن ساز دانشور آتا ہے وہ اپنے تعمیر کیے ہوئے وجدان میں ہی زندہ رہتا ہے۔ اس کا ودیعت کردہ شعور اور تحرک اپنی جامعیت اور اساسی ماہیت میں ہی اس کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ یہی کچھ اقبال کے ساتھ ہوا۔ اقبال نے تمام خودی و بیخودی، مرد مومن و مرد سالک اور جو بھی تصورات اور تبرکات ہیں ان کا تانا بانا کسی مروجہ مذہب یا فلسفے سے جا ملتا تھا اور اس میں صریحاً کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ چراغ جلتا ہے۔ دنیا میں نئی بات تو کوئی بھی نہیں ہے۔ انسان ہی جب پرانا ہے، ہاں

کہنے کا انداز نیا ہوسکتا ہے اس کے محرکات وثمرات مختلف ہوسکتے ہیں۔ جو چیز اقبال نے دی اور جو خالصاً ان کی اپنی دین تھی وہ ہے حرکیت (Dynamism) اقبال نے ہر چیز اور ہر قدر کو ایک حیرت انگیز سرعت اور سماجی رفتار عطا کردی۔ اس لحاظ سے انہوں نے اپنا فکری سفر جہاں تمام کیا وہاں سے آگے کا سفر انتہائی حرکی اور برقی رو لئے ہوئے ہونا چاہئے تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا بلکہ قطعاً غیر فطری تھا کہ ان فکر کی بازگشت اور جزوی پیکر تراشی کو منزل مقصود بنالیا جائے یہ تو اقبال کے فلسفہ حرکت کی نفی ہوئی اور ایک جمود سا آجاتا اور آگیا۔ اقبال نے خود ہی تو کہا تھا اپنے انتہائی Potent اور جامع مصرعے میں۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی اقبال کو پسند کیا، پھر disown اور پھر rediscover کیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں دراصل جوش فکر اقبال کی توسیع ہیں۔ اقبال کو پوری جامعیت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جوش کو قرینے سے پڑھا اور سمجھا جائے۔ ہر آدمی اپنے جبلی اور فکری تفاوت سے ناپا جاتا ہے اقبال نے جو ذہن تعمیر کیا تھا یا جو اذہان تعمیر کئے تھے ان کی اجتماعیت اور توانائی کی اگر حاشیہ آرائی ہوئی تو فکر اقبال کو خانہ بندی کے حبسِ بے جا سے کوئی نکال نہیں پائے گا۔ اقبال کی Legacy میراث فکر میں جوش سب سے زیادہ توانا، حساس، تحرک اور اثر آفریں Potent ہے۔ یہ عقل و عشق کا جھگڑا بہت پرانا ہے اور دونوں اپنی ارتقائی شکل میں ایک ہی سکے کے دو رخ کی مانند ہیں۔ عقل سلیم اور عشق باہم متصل ہیں متصادم نہیں۔

اب آتے ہیں اس باب کی طرف جس کی تکمیلیت کے بغیر نثر جوش کیا اردو انشا پردازی کی کوئی گفتگو مکمل نہیں ہوسکتی۔ یقیناً آپکا اندازہ صحیح ہے وہ غیر معمولی تصنیف یادوں کی برات ہے اور اس کے متن سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اسلوب، زبان و بیان کے طلسم اور لفظ و معنی کی بوقلمونی پر تھوڑی سے گفتگو کرتے ہیں۔ رشید حسن خان کے مضمون یادوں کی برات سے چند اقتباسات نقل کروں گا اور پھر اپنی بات کو آگے بڑھاؤں گا۔ رشید حسن خان صاحب جوش کی شاعری کے بہت مداح نہیں ہیں اس لئے ان کے بیان کی اہمیت اور زیادہ ہے ”ہم معنی یا قریب

المفہوم لفظوں کی تکرار اور تشبیہوں، استعاروں کی کثرت مرقع نگاری کے انداز کو روشنی بخشتی ہے اور جس چیز منظر یا واقعے کا بیان ہے اس کو جگمگا دیتی ہے'' یہاں صحیح معنوں میں الفاظ اپنی خصوصیت کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ جزئیات مرتب ہونے لگتی ہیں۔ اور تصویر پوری تفصیلات کے ساتھ بننے لگتی ہے'' پیرایۂ اظہار کا کمال اس طرح کارفرما ہوتا ہے کہ مرقع میں زندگی کی حرارت سی دوڑنے لگتی ہے۔ منظر متحرک ہو جاتا ہے اور چیزیں بولنے لگتی ہیں''۔ خان صاحب اور آگے چل کر لکھتے ہیں ''جب میں نے پہلی بار اس کتاب کو پڑھا تو بہت سے مقامات پر یہ محسوس ہوا تھا جسے پہلے پہل یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ ہماری زبان میں الفاظ کا اس قدر ذخیرہ ہے''۔ یادوں کی برات کے موسموں خصوصاً برسات کے متعلق جوش کے ایک اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''لفظوں کے آہنگ پر آپ نے غور کیا؟ اسلوبیاتی تنقید کا کوئی اچھا طالب علم اس آہنگ کا تجزیہ بہتر طور پر کر سکتا ہے۔'' لفظوں کا انتخاب جس صوتی مناسبت کے تحت کیا گیا اور ان کی ترتیب میں جو رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اس نے ایک خاص آہنگ کی تشکیل کی ہے جسے موضوع سے (برسات) خاص نسبت ہے'' ایک اور جگہ لکھا ہے کہ جوش کا یہ کہنا اپنے ایک دوست سے کہ چہل قدمی کو نکلو ورنہ ان نخروں میں تو کرن پھوٹ جائیگی اور دھند لکے کا سہاگ لٹ جائے گا''۔ کیا بے مثال انداز بیان ہے۔ الغرض رشید حسن خان صاحب نے جوش کے بے شمار انتہائی حیرت انگیز اور تخلیقیت سے لبریز اقتباسات اور جملوں پر متعدد بار اپنی عقیدت اور پسندیدگی کا کھل کے اعتراف کیا۔

''بیان میں ایسی شگفتگی اور عمدہ تشبیہوں کی ایسی پچی کاری ہے کہ خوش ذوق قاری سرشاری کے احساس میں شریک ہو جاتا ہے اور یہ بیان کا کمال ہے''۔ ''یہ اردو کی دل چسپ ترین کتابوں میں سے ایک ہے''۔ ''اس میں انشا پردازی کا جو حسن ہے شخصیتوں کے جو خاکے ہیں۔ (وہ ناتمام ہی) منظروں میں جیسا رنگین بیان ہے، ختم ہوتی جاگیردارانہ تہذیب کی جو تصویر کشی ہے تشبیہوں، استعاروں کا جو کمال ہے۔ ہمارے نئے لکھنے والوں کو تو خاص طور سے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ایک تشبیہ نے معمولی سی بات کو غیر معمولی بنا دیا اور اس تشبیہ کے مناسبات نے جملے میں روشنی دوڑا دی ہے جس سے پورا منظر جگمگا اٹھا ہے'' خان صاحب نے تو بہت کچھ لکھا ہے۔

اور میں یہ تبصرے اور جملے پڑھ کر یہ سوچتا رہا کہ جو محاسن و کوائف رشید حسن خان صاحب نے لکھے وہ تو بلا تخصیص، تخلیقی عمل اور نادرہ کار تخلیقی عمل کا حصہ ہیں۔ نثر اور نظم کا فرق تو وزن پہ قائم ہے شعریت کی قید کسی ایک پہ تو نہیں اب کسی کو یہ فن یا تو ودیعت ہوا ہے یا نہیں ہوا اور یہی بات اس فن کے پارکھ کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے تو پھر یہ کیونکر ہوا کہ آپ کو نثر نے اتنا متاثر کیا اور نظم نے اتنا متنفر خیر۔ اس کے برعکس ڈاکٹر آغا سہیل کا رویہ انتہائی جامع اور تخلیق کے ورود سے متعلق ہے بلا کسی نثری یا شعری تخلیق کے جوش جس لفظ کا استعمال کرتے ہیں اس کے ایک ایک مسام میں قوت نمو موجود ہوتی ہے۔ اس لفظ کے صوتی آہنگ میں بھی نغمگی اور عنایت ہوتی ہے یعنی جو سانچے ان کے احساس جمال اور ذوق سلیم نے ان کے لاشعور میں تراش دیئے تھے الفاظ انہیں سانچوں سے ڈھل ڈھل کر برآمد ہوتے تھے''۔ الفاظ کی یلغار ان کی متخیلہ پر اس شدت سے ہوتی ہے کہ وہ نپے تلے الفاظ چن کر اور معانی و مفاہیم تعین کے بقیہ لفظوں کو فوری متخیلہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ یہ عمل اس قدر تیزی اور سرعت سے انجام پاتا ہے کہ عام اور معمولی شاعر کی متخیلہ اس کی پیمائش تک سے عاجز و قاصر ہے۔

شاید اسی غیر معمولی تخلیقی عمل کی وجہ سے جوش کا اسلوب اتنا متحرک اور فعال ہے کہ اسے فکر کو جذبہ اور معمول کو محسوس بنانے میں ذرا سا بھی وقت نہیں لگتا اور معنی و مفہوم کی ارتقائی تمثالیں خود بخود ترشتی چلی جاتی ہیں۔ مگر شاید اس نوع کے تخلیقی اعجاز کے ادراک کے لئے جو مشقت اور سنجیدگی درکار ہے وہ آج کے قاری میں نہ ہو۔ پھر بھی امید ہے جوش کی تفہیم نو کا دور زیادہ سنجیدہ ہوگا اور وہ براہ راست جوش کو پڑھ کر ہوگا۔

☆☆☆

عصر جدید اور جوش ملیح آبادی

ڈاکٹر یحییٰ احمد
ڈیرہ اسماعیل خان

مقام مسرت وفخر ہے کہ ارتقاء رسالہ کے جناب راحت سعید نے ''جوش صدی نمبر'' کے عنوان سے ایک بنیادی تحقیقی کتاب پیش کی ہے۔ پھر عروس البلاد کراچی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ایک تنظیم کراچی آرٹس کونسل نئی صدی میں عظیم المرتبت حضرت جوش ملیح آبادی کے کام کے حوالے سے ایک عالمی کانفرنس منعقد کر رہی ہے۔

آنے والا دور جوش کی تلاش کا دور ہے۔ جوش شناس محققین اور لکھاڑی یہ معرکہ سر کریں گے جوش کو پہلے ہی اکیسویں صدی کا مفکر العصر لکھا جا رہا ہے۔ میرے موضوع کے تین حصے بنتے ہیں۔ اولاً جوش کا مستقبل سے متعلق شعور ثانین ماضی میں جوش کا تہذیبی، سماجی اور سیاسی حالات کا ادراک اور آخر میں عصر جدید اور جوش ملیح آبادی کے افکار رقم کیے گئے ہیں۔

خواتین وحضرات میرے مضمون کے محرک جوش کے یہ اشعار ہیں۔

جوش کے افکار کو مانے گی مستقبل کی روح
آج اگر رسوا یہ مرد نا مسلماں ہے تو کیا

اور۔

سو سال بعد آئے گی جس کی زمین پہ فصل
میں بدنصیب وہ ثمر نو رسیدہ ہوں

سچ لکھنے کی وجہ سے یہی خیال ان کی شاعری میں گاہے بگاہے مکرر دکھائی دیتا ہے۔ بقول جوش۔

دنیا بہت وسیع تھی لیکن میرے لیے
آزادیٔ خیال نے زنداں بنا لیے

جوش نے اپنی شاعری اور نثر میں اک نئے میلاد کی نوید سنائی۔ نوجوانوں کو اٹھ کھڑے ہونے کے احکامات دیئے اور عقائد پارینہ کو تاریخ کے عجائب گھر تک پہنچانے کا مشورہ دیا۔ مستقبل کو تابندہ و درخشاں بنانے کے لئے اپنی نظم 'فتنہ خانقاہ' میں پیران سالوس اور حضرت مولوی صاحب کا محاسبہ اور محاکمہ ضروری سمجھا۔ جوش نے ماضی کو جس انداز سے لیا ہے ان کی نظم 'میرے اجداد' کو غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

جہاں فکر اجداد ہے خیمہ زن
میرے فکر کا اب نہیں وہ وطن

یا یہ رباعی دیکھئے۔

ابوسعیدہ روایات کی حرمت نہ کرو
تحقیق و تجسس کی اہانت کرو
دین آبا بھی تم کو لاحق ہوجائے
ماں باپ سے اتنی بھی محبت نہ کرو

بحیثیت مفکر العصر جوش نے اپنی شاعری اور نثر میں اپنے افکار کو چھپانے کی حسب روایت کوشش نہیں کی ''یادوں کی برات'' پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ واقعات کا عیاں بیاں ہے۔ جوش جیسا حق گو مدتوں بعد ملتا ہے۔ دہلی میں ایک ملاقات کے دوران جے این یو یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حسن سے مکالمہ ہوا انہوں نے جوش کو مفکر العصر کے بجائے فکر کے در کھولنے والا مفکر لکھنے کا مشورہ دیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی اقبال اور جوش کے موازنہ کو غیر متوازن قرار دیا اور کہا کہ ایسی مناقشوں نے جوش کی حیثیت کو کم کیا ہے۔ اتنا طے ہے کہ جوش کے افکار منفرد، واضح اور عوام دوست ہیں ان کے افکار کی پذیرائی عالمی سطح پر ہو چکی ہے۔ بنے بنائے دو قومی نظریے کے سانچے میں جوش کو فٹ نہیں کیا جاسکتا۔ مزاحمتی روایت، جمہوریت اور رپختوں نسل کی وجہ سے وہ

کبھی اسٹبلشمنٹ کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔ وطن عزیز پاکستان کے لئے لکھا جانے والا ایک ملی ترانہ جوش کے ذہن کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا ملی منشور قرار دیا جاسکتا ہے انکی حب الوطنی کسی کی سٹوفکیٹ کی محتاج نہیں۔

ملی نغمہ:

اے وطن ہم ہیں تیری شمع کے پروانوں میں
زندگی جوش میں ہے ہوش ہے ایمانوں میں

آنے والے وقت کے شعور کے حوالے سے انکی شاعری میں مستقبل کا صیغہ غور طلب ہے پھر لفظی آن بان، جوش، گھن گرج، شوکت الفاظ اور طمطراق دیدنی ہے۔ نظم 'روح استبداد' کا فرمان میں دیکھئے:

ہاں اے میرے ذی ہوش فسوں کا رسپوتوں
جاگے ہوئے محکوم دماغوں کو سلادو
سینے میں کھٹکتی ہے میری جوش کی ہر سانس
اس شاعر گستاخ کو سولی پہ چڑھا دو

اس لحاظ سے جوش شاعر فردا کی حیثیت سے ممتاز مقام رکھتے ہیں انہوں نے 'حرف آخر' نظم میں مستقبل کی نوید کچھ اس انداز سے دی کہ لگتا ہے فوجیں کارواں در کارواں منزل کی طرف گامزن ہیں۔

بہادرو وہ خم ہوئیں بلندیاں بڑھے چلو
پئے سلام جھک چلا وہ آسماں بڑھے چلو
فلک کے اٹھ کھڑے ہوئے وہ پاسباں بڑھے چلو
یہ ماہ ہے وہ مہر ہے یہ کہکشاں بڑھے چلو
لئے ہوئے زمین کو کشاں کشاں بڑھے چلو

اس لحاظ سے انہیں امید کا شاعر [illegible] جاتا ہے ان کے غیظ و غضب [illegible] جیسی لعن طعن کو ایک طرف رکھ کے ان کے ہاں اکیسویں صدی کے مسائل کا ادراک [illegible] جاتا ہے۔

ہمارا دوسرا موضوع جوش کی زندگی میں ان معرکوں کا ذکر ہے جو وقت نے اُن کے سامنے لاکھڑے کئے اور انہوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ جوش نے بجا کہا ہے :

پیر ماضی سے جواں عہد لیا ہے میں نے
سیف پگھلا کے قلم ڈھال لیا ہے میں نے

جوش کی ذہنی آبیاری کے لئے جن مشاہیر نے انہیں متاثر کیا ان کا تھوڑا سا ذکر ہو جائے۔ جوش کہتے ہیں ۔

''ابتداء میں شرر اور سرشار کی نثر اور داغؔ اور انہیں کی شاعری سے متاثر ہوا۔ آگے بڑھ کر مومنؔ، میرؔ، غالبؔ اور نظیر اکبر آبادی نے متاثر کیا پھر ٹیگوریت نے دل میں گھر کرلیا۔ اس کے بعد اقبال آئے مگر وہ مجھ پر چھا نہ سکے پھر ورڈ سورتھ کو پڑھا اور اس کا اثر قبول کیا پھر مجھے گوئٹے نٹشے میکسم گورکی، شیلے، وکٹر ہیوگو، برگساں، شوپنہار اور کارل مارکس نے متاثر کیا فارسی میں سعدی، نظیری، خیام، عرفی اور سب سے زیادہ حافظ نے دل پر اثر کیا۔ جواب تک ہے اور ہمیشہ رہے گا ہندی میں تلسی داس اور کبیر سے متاثر ہوا''۔ (جوش کا لسانی مطالعہ از راقم)

اس پر طرہ یہ ہے کہ وہ آفریدی ہیں اور فقیر احمد خاں گویا کے شعری وراثت کے امین ہیں لکھتے ہیں۔

روح ہے مجھ میں صعوبت کے پرستاروں کی
زندگی جیتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

اور ان کا زمانہ کیا کہنا۔ دو عظیم جنگیں، روس کا انقلاب، تحریک خلافت اور آزادی کی لڑائی۔ اس لئے ان کے ہاں شاعری کا الگ دبستان ملتا ہے۔ وہ بطور مجاہد آزادی رزمیہ شدت سے بھرپور غصیلے، جوشیلے اور نوکیلے الفاظ لے کر میدان کارزار میں اتر آئے۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں ۔

''جوش کے نوکیلے، غصیلے اور جوشیلے الفاظ کی ادائیگی کے دوران ان کے
تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔'' (آج کل دہلی)

بطور مجاہد آزادی انہوں نے شہرت حاصل کی اس قبیل کی نظمیں خطاب، تلاشی، وفاداران ازلی، پیرزن لیگ، بغاوت اور شکست زنداں میں انہوں نے وقت کے فرعونوں اور ظالم حکمرانوں کو للکارا ہے۔ جس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دیتی رہے گی۔ اور وہ مزاحمتی مفکرین کی طرح بطور مجاہد آزادی ایک مستقل مقام رکھتے ہیں۔ وہ دنیا میں ہر باوقار قوم کے ہیرو مانے جائیں گے۔ دوران حصول آزادی انہوں نے نہ صرف ترقی پسند فکر کو اپنایا بلکہ اپنے لئے الگ راہ کا تعین کیا۔ ان کو بڑے بڑے جلسوں میں سنا اور سراہا جاتا ان کے رسالہ 'کلیم' میں مکرر جہاد آزادی کا سنہرا منشور چھپتا رہا۔ ایک نظم غلاموں سے خطاب کا لہجہ ملاحظہ ہو۔

اکسائے میرا شعر اگر جذبہ ہائے جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاج سنگ

خود موت سے حیات کے چشمے نکل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں

میرے رجز سے لرزہ براندام ہے زمین
افسوس تیرے کان پہ جوں رینگتی نہیں

انہوں نے سچ لکھنے کی روایت کو جنم دیا اور قائم رکھا۔ ان کا انقلاب آزادی کے بعد بھی جاری وساری رہا۔ یہ شعر آپکو ہر باذوق قاری سنائے گا جوان کے مشہور اشعار میں سے ہے۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوش ایک مزاحمتی دبستان کے بانی اور خاتم رہے خطابت ان کا فن ہے ان کے مذید معرکوں میں برسر پیکاری خورشید علی خاں کے الفاظ سے یوں عیاں ہے۔

(i) ''سیاسی اقتدار پرستی، جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ نظام معیشت، ان میں بین الاقوامی استحصالی طاقتوں کی ریشہ دوانی اوران کا علاقائی مراعات یافتہ طبقات کے ساتھ گٹھ جوڑ بھی شامل ہے

(ii) ''قدیم عقائداوررسومات کی ذہن انسانی پر مضبوط گرفت

(iii) ''مذہبی عقائد۔جن کے سبب زندگی کی نئی حقیقتوں سے انسانی ذہن آشنانہیں ہو پار ہے ہیں۔

(iv) ''ایسی معاشی، معاشرتی اور مذہبی قدریں جن کا جبر صحت مند معاشرتی تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ ہو

(v) '' طبقاتی معاشی، معاشرتی نظام

(iv) ''ادیان اوطان لسان کے بت۔

(ارتقاء جوش صدی نمبر)

ان زخموں کا مرہم جوش نے کچھ اس طرح تجویز کیا ہے۔حریت فکر' انسان دوستی، تسخیر کائنات، حیات وشباب پر دائمی قدرت اور پرامن معاشرے کی تشکیل نیز انسان دوستی کا عالمی تصور۔ جوش اپنے افکار خود تشکیل دیا کرتے ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ولولہ، دبدبہ اور بہادری نمایاں ہیں۔آزادی کے وقت جوش کا انڈیا میں دس سال رہ جانا ان کی شخصیت کو متنازع نہیں کرتا دراصل لڑائی کسی اور جگہ تھی اور دونو زائد ملکوں کو لڑانے کی پوری کوشش ہوئی۔اب بھی دونوں ملکوں کی عوام کو قریب لانے کے لئے افکار جوش کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔اور وہ تعلقات کا پل بن سکتے ہیں۔ چہ جائے کہ انہیں ایک کہانی 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کا کردار بنایا جائے۔ وہ ایک آفریدی اور اردو زبان کے بہت بڑے عاشق تھے اس حوالے سے ان کا کردار نکھرتا نظر آتا ہے۔انکی ایک نظم 'ماتم آزادی' دونوں مما لک کے عوام کو فکری طور پر بیدار کرتی ہے۔

کھدر پہن پہن کے بداطوار آگئے
جامہ سفید لے کے سیاہ کار آگئے

رحمان کی بات چلی اور نہ رام کی
گدی سے کھینچ گئی جو زباں تھی عوام کی

یا یہ کہ

انسان کہاں ہے کس کرے میں گم ہے
یاں تو ہندو ہے کوئی اور مسلماں ہے کوئی

آزادی کے بعد انکے دو بڑے موضوعات ہیں۔ انسان دوستی اور اردو سے عشق لیکن مخالفین نے ہر جگہ سینہ سپر ہو کر مخالفت کی تو جوش کو کہنا پڑا:

رہا ہوں ہندو کی نظروں میں مسلم
بنا زندیق جو پاکستان آیا
ادھر جن سنگھیوں نے دھول اڑائی
ادھر مودودیوں نے غل مچایا
مسلسل میں کبھی جینے نہ پایا
رحیماں داورا مولا خدایا

جب جوش نے اردو کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا

وطن نے جب بجھا دی شمع اردو
تو میں کم بخت پاکستان آیا

اس قسم کے اردو سے متعلق جذبات ایک گروہ کو ناگوار گذرے اور اس گروہ کی مراد بھی بھر آئی کہ اپنے بونے قد کو بڑھانے کے لئے ایک مشہور مفکر پر لعن طعن کریں چنانچہ ایک اخبار خم ٹھونک کر آ گیا دوسرا 'ساقی' کا جوش نمبر ایک ضخیم پلندہ ہونے کے باوجود اپنے اثرات قائم نہ رکھ سکا۔ تاریخ نے ساقی رسالہ پر گرد ڈال دی لیکن جوش آج بھی پوری دنیا میں اردو کا ایک بہت بڑا مجسمہ ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ جب تک اردو رہے گی جوش ملیح آبادی کا نام بلند رہے گا۔ پاکستان کی فضاء جوش جیسے سقراط حیثیت اور منصوری مسلک کے لئے موزوں فضا ہے۔ یہاں مُلا

کی ظاہری نمود و نمائش کو بھی پرکھنے کا موقع ہاتھ لگا۔ انہیں اک ایسا مسلک پیش کرنے کا موقع ملا جس میں صوفی کے رشحات فکر کی بازگشت سنائی دی بلکہ وہ مذہب کی انسان دوست شکل سامنے لانے کے متمنی تھے جوش نے کہا:

اللہ کو ہتھیار بنانے والو
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

یا یہ کہ

جوش جیسا کافر اور کافر گفتار
اندر سے مسلماں ہے یہ معلوم نہ تھا

ظاہر ہے کہ سخت گیر ملائیت کے اس دور میں جوش کو زیر اعتاب آنا تھا یہ واقعات جوش شناسوں سے پوشیدہ نہیں جوش کو کہنا پڑا کہ

میں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفے میں حسین
سب شہادت کے ہیں آثار چنا جور گرم

افکار جوش میں غریبوں کی ہمدردی، انقلاب کی تمنا، نوجوانوں کی ولولہ انگیزی اور رجعت پسندوں پر تنقید خاص موضوعات ہیں۔ قومی آزادی کا بھرم رکھا گیا ہے انسان دوستی کو نصب العین کہا گیا ہے خوشامدی ٹولوں اور سرمایہ داری کی مخالفت ہے۔ سستی اور کاہلی پر تبصرہ ہے، مہاجن کی مذمت ہے۔ تہذیبی تاریخی اور سماجی موضوعات کے ساتھ ادبی محاذ پر بھی انہوں نے روشن فکر کی ترویج کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انہیں یہاں ایک نئی مشکل کا سامنا تھا وہ حق گوئی اور بے باکی کے لئے مزاحمتی شاعری کو بڑھاتے چلے گئے ان کا کہنا تھا۔

اک تازہ کربلا سے ہے نوع بشر دوچار
پھر نائب یزید ہے دنیا کا شہریار

اس کے علاوہ اردو کی شاعری میں روایتی مضامین کو انہوں نے آب حیات پلایا محسن احسان لکھتے ہیں ۔

''جوش کی شاعری میں حمد وثنا، صبر ورضا، غیب وشہود، تغزل وتصوف، تموج و عشق، حکمت ومعرفت، طلب وتمنا، سکوت وصدا، امید ونا امید، مکر وریا، نخوت حرص وہواس اور غبت عباد وقبا کی سچائی بھری اور دلدوز تصوریں نظر آتی ہیں کہ قاری داد دیئے بغیر نہیں رہتا۔ انہوں نے زاہد، صوفی، مدرس، مولوی، مفتی، ناصح فقیہ شہر، اور ریا کاروں کا مذاق اڑایا۔'' (ارتقا جوش صدی نمبر)

حال میں آنے والی کتاب 'جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ' میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی افکار جوش کے حوالے سے ایک نئی سمت سے متعارف کراتے ہیں ان کا لکھنا ہے کہ افکار جوش کو سر سید کی روشن فکری تحریک کے روشنی میں پرکھنا چاہئے۔ اس بات پر دو طرح کے اعتراض وارد کرتا ہوں ایک تو 'یادوں کی برات از خود سر سید تحریک کو انگریزی اطباع کا ادارہ کہہ رہی ہے۔ جہاں سے جوش کو خارج کیا گیا تھا۔ دوسرا بونیفسٹ پارٹی کبھی بھی سر سید تحریک میں ضم کرنیکی اجازت فراہم نہیں کرسکتی۔ اس لئے جوش کو سیکولر انسان دوست کے تناظر میں دیکھا جانا ضروری ہے۔ رباعی ملاحظہ ہو:

علت کا نہ معلول وقضا کا منکر
حاشا نہ خبر نہ مبتدا کا فکر
یاروں نے تشخص کا تراشا ہے جو بت
الحاد ہے صرف اس خدا کا منکر

آج کے موضوع عصر جدید اور جوش کے حوالے سے یہ کہنا ضروری ہے کہ جوش اپنے روشن فکر کلام کے حوالے سے آج کے عہد کا نہ صرف ادراک رکھتے ہیں بلکہ مداوا بھی ان کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مفکر العصر حضرت جوش ملیح آبادی علامہ اقبال پر بعض حوالوں سے سبقت رکھتے ہیں۔ ایک حوالہ ان کے عالمگیر افکار اور انسان دوست شاعر کا ہونا ہے۔ انہوں نے اپنی نثر اور نظم میں عقل پسند اور سائنسی اور مادّی حالات کا بھرپور تجزیہ پیش کیا یہ غلط فہمی بھی دور کرتا چلوں کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے ایک صدر مملکت کو روشن خیال سمجھ کر مشورے دیئے تا کہ

ملک کو روشن خیال اور ترقی پسند بنایا جا سکے۔ ترقی پسندی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ جنہوں نے اسّی سال کی عرق ریزی کے بعد حالات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کے اٹھائے گئے سوالات کی روشنی میں عصر جدید کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ آج دنیا میں فکری سطح پر چند ایک سوالات پیدا ہوئے اگر ان سوالوں کے جواب نہ مل سکیں تو اسے عبوری عہد کہنا مناسب ہوگا مکمل جواب کی فراہمی آنے والے وقت پر چھوڑی جا سکتی ہے۔ بہر حال جوش نے کہا ہے۔

قسم اس وقت کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا
کہ اے میرے وطن جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا
میری تلوار میدان وغاں میں جگمگائے گی
تیرے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

اس کے علاوہ 'حرف آخر' نظم پڑھنے کا وقت ہے جس میں جوش نے آنے والے وقت کے ادراک کی کوشش کی آج کے مسائل کا ادراک جوش کی شاعری میں ڈھونڈا جا سکتا ہے میرے نزدیک انسان کے عالمی مسئلے کچھ یوں ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوشلسٹ سوویت یونین کا ماڈل کیسے ٹوٹا؟ ۹/۱۱ سے پہلے اور بعد کے دہشت گرد کون ہیں اور ان کی سرگرمی کب تک ہے۔ یونی پولر ورلڈ نے دنیا کو کیا دیا۔ فوکویاما کا نظریہ (تاریخ کی موت) کیا نتائج دیتا ہے نیل ازم ڈی کنسٹرکشن کا عبوری دور کب تک ہے۔ سرمایہ داری کے بعد شاعری اور ادب کی کیا حیثیت ہوگی پرانے وقتوں کی داستانوں کا اثر شخصیات اور سماج پر ہے کہ نہیں فارسی شاعری کی نصیحت آموزی کا کیا ہوا۔ تاریخ کے کونسے گوشے پڑھائے جا رہے ہیں آج کل ریاست کا تصور کیا ہے اور تیسری عالمی جنگ کے منڈلاتے خطرات کو کیسے ٹالا جا سکتا ہے۔ جوش کے فکر انقلاب کے معنی کیا تھے۔

جوش نے تو صرف اتنا کہا ہے۔

متاعِ کفر ملے یا سعادت ایماں
جلاؤ مشعلِ تحقیق ہرچہ بادا باد
ہو جائے گی جب فکر بشر کی تکمیل

ذہنوں پہ کھلے گا علم عقل جلیل
ہوجائیں گے اس وقت سراسر معدوم
قاضی وسپاہ وشحنہ وشاہ وکیل

آج کا دور بیگانگی، اقدار کی پامالی اور شکست وریخت کا دور ہے لالچ اور ہوس گیری نے عالم گیر انسان کو جکڑ رکھا ہے۔ تہذیبوں نے اپنے رنگ دکھا دیئے۔ آیا یہ لفظ معتبر رہ گیا ہے کہ نہیں۔ سرمایہ کی دوڑ نے مہذب اقوام کو عالمی سرحدات کا بھرم باقی نہ رہنے دیا۔ آج تاریخ انسانی کے وہ تمام عوام دوست اقدار قصہٴ پارینہ ٹھہرائے گئے جن پر اقوام ایک دور میں فخر کرتیں۔ آج پھر ایک مرتبہ چنگیز اور ہلاکو کے لشکروں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ وہ غریب طبقہ جس کی وکالت جوش جیسے مفکر کیا کرتے آج خود کو بے سہارا سمجھتے ہیں۔ ترقی یافتہ اقوام فرقہ وارانہ فسادات کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں انسان کو ذبح کرنا، دین اسلام کی عبادت گردانا گیا ہے۔ ہماری سرزمین دہشت گردی کی وہ عبرت ناک داستان بنادی گئی کہ بے ساختہ ماتم آزادی نظم پڑھنے کو جی چاہتا ہے جوش کے آباؤ اجداد کی سرزمین درہ آدم خیل اور اس سے آٹھ میل ادھر محبت کے شاعر احمد فراز کا شہر کوہاٹ بارود کے شعلوں کی لپیٹ میں ہے ہر روز آدم زاد کے خون کے چیتھڑے ہوا میں اڑتے ہیں۔ جنازے تک محفوظ نہیں اسی لرزہ خیز عمل سے جوش کی روح قبر میں کانپ جاتی ہوگی۔ جوش نے بجا کہا ہے۔

پھر گرم ہے فساد کا بازار دوستو
سرمایہ پھر ہے برسر آزار دوستو
تاکے یہ خون اندک و بسیار دوستو
تلوار ہاں اپنی ہوئی تلوار دوستو
جو تیز ترہو خون امارت کو چاٹ کر
رکھ دے جو سیم وزر کے پہاڑوں کو کاٹ کر

آج جوش کی فکر جس کا خلاصہ حی علی الانسان ہے اور جس کو سننے کے لئے کوئی تیار نہ تھا

آج جوش کی طرف سے بدلہ لینے کا وقت ہے کہ وقت کی گرد نے جوش کے خلاف میل کو ختم کر دیا وہ ایک سرخرو ہیرو (Legend) ترقی پسند مفکر کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں۔ آج بابا ذہین شاہ تاجی کی تلاش کریں جس نے انھیں صلح کل نظمیں 'بول اک تارے' لکھنے کا مشورہ دیا۔

آج جن کو نظام کش حملہ کرنا تھا خود کش حملہ کرتے ہیں جوش نے بروقت ملا گردی کے اس فتنے کو روکنے کے لئے اشعار کہے اس لئے ان کی پیشین گوئیاں صحیح ثابت ہو رہی ہیں آج یزیدیت کے اس دور میں حسینی قافلے میں شامل ہونے کا وقت آیا ہے۔ اور عالمی یزید کے خلاف سینہ سپر ہونے کا وقت ہے جوش نے کہا:

جب حکومت قصر ہائے معدلت ڈھانے لگے
ان مواقع پر حسینی بانک پن سے کام لے

انسان کا انسان کے خلاف نفرت کا زہر پہلے بھی ہوا کرتا تھا لیکن غیر پیچیدہ معاشرے میں تریاق حاصل ہوتا تھا آج سرمائے کے کالے ناگ نے اور انسان کے اندر کے وحشی نے وہ جنون دکھلایا ہے کہ اس کے آگے بین بجانا کسی ایک کے بس کی بات نہیں دہشت گردی کے اس جن کو فکر جوش کے حوالے سے اس افریت کو طشت از بام کیا جاسکتا ہے جوش کی نظمیں بول اک تارے' اے نوع بشر جاگ' اور 'نئے میلاد' کو دیکھنے کی ضرورت ہے، میں اپنے مضمون کا اختتام ان اشعار پر کرنا چاہوں گا۔

فرق من وتو کفر ہے احساس دوئی شرک
ہاں آؤ کہ اب دھوم سے یہ نعرہ لگائیں
محدود تھے کل دوست سے آداب محبت
دشمن کو بھی اب آؤ کلیجے سے لگائیں
ہاں آؤ کہ اب کعبہ وکاشی سے اٹھا کر
انسان کو اللہ کی مسند پہ بٹھائیں

☆☆☆

جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن، ایک تجزیہ

علی احمد فاطمی

ڈاکٹر ہلال نقوی اردو زبان و ادب کے اُن خاموش اور سنجیدہ ادیبوں اور محققوں میں سے ہیں جو ظاہری شور وغل اور نمود و نمائش سے بے نیاز نہایت خاموشی اور سنجیدگی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ وہ اُن محققین میں سے ہیں جو اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے ایک بڑے موضوع پر اسی بڑے پھیلاؤ کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ہلال نقوی کا موضوع ہے جوش ملیح آبادی، اور ہم سب جانتے ہیں کہ جوش نے زندگی بھر جس انداز کی شاعری کی اور جس انداز سے زندگی گذاری اُس میں نظم وضبط کا دخل کم تھا اور شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا وہ ملیح آباد میں پیدا ہوئے، لکھنؤ، آگرہ، دہلی، حیدر آباد، ممبئی جیسی جگہ اُن کے چکر لگتے رہے۔ اس کے بعد ہجرت کراچی، اسلام آباد اور نجانے کہاں کہاں ــــ ایسی دربدری اور سنگ خراشی سے اُن کے فکر و نظر میں وسعت ضرور آتی رہی اور نظریۂ شعر و ادب کو انتظام و استحکام ضرور ملتا رہا لیکن ذاتی زندگی میں انتشار و بکھراؤ ضرور آ گیا چنانچہ اُن کا بہت سا ادبی اثاثہ بکھر سا گیا جو آج بھی نایاب و کمیاب ہے۔ ہلال نقوی اُن خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنھیں مجتبیٰ حسین کی وساطت سے جوش کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے ہیں۔ اُن سے ہم کلامی اور تبادلۂ خیال کرنے کے سعادت مندانہ مواقع۔ ہلال نقوی نے ان سب کا فیض اُٹھایا اور جوش پر بڑے اہم کام کر ڈالے۔ جوش پر اُن کی کئی کتابیں ہیں۔ تازہ ترین کتاب ہے ''جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن''۔ جسے اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے بڑے اہتمام

سے شائع کیا ہے جو پاکستانی ادب کے معمار کے سلسلے کی کڑی بھی ہے۔ کتاب اور مصنف کے بارے میں اکادمی کے صدر اور ممتاز شاعر افتخار عارف نے ابتدا میں لکھا ہے کہ:

''عہدِ حاضر میں اردو ادب کی نامور کرشماتی شخصیت حضرت جوش ملیح آبادی سے کون واقف نہیں۔ وہ شاعرِ انقلاب بھی تھے اور شاعرِ رومان بھی۔ ترقی پسند فکر اور خرد افروزی اور احترامِ آدمی کی روایت کے نقیب کے طور پر بھی دنیا اُن کا احترام کرتی ہے۔''

اِس کے علاوہ وہ مصنف کے بارے میں بھی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ہلال نقوی اردو کے بہت فاضل تنقید نگار اور محقق ہیں۔ اُنھوں نے اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے لئے ''جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن'' لکھ کر یقیناً علم و ادب کی بہترین خدمت کی ہے۔''

خود مصنف نے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''شعری جہات اور تخلیقی توانائی کے اعتبار سے جوش صاحب کا نام اردو کی ادبی تاریخ میں ایک بہت تابناک اور درخشاں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۸۸ سال کے عرصۂ حیات میں وہ کم و بیش ۷۵ سال تک شعر و ادب کے تخلیقی، تہذیبی و فکری سلسلوں سے وابستہ رہے۔ ہمارے ادب میں شاید ہی کسی تخلیق کار کی تخلیقی زندگی ادب و فن کے اتنے طویل جادے سے گزری ہو۔ یہی سبب ہے کہ ادبی و فنی ادراک کے ساتھ ساتھ ان کے کثیرالتصانیف ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ اُن کی تصانیف اور شعری و نثری مجموعے ہماری دسترس سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں ان پر کسی بھی تنقیدی و ادبی کام کی ضرورت و اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ جس کے توسط سے ہم آج کے قاری کو اُن کی تخلیقی امانتوں سے قریب تر لا سکتے ہیں۔''

''جوش صاحب کی بنیادی شناخت اور پہلا تعارف اُن کا شاعر ہونا ہے
لیکن وہ صرف شاعر نہیں تھے، تنقیدِ شعر سے انشا نگاری اور ادبی ادارت
سے لغت نویسی تک اُن کی خلاقانہ اور دانشورانہ رسائی کے متعدد زاویے
ہمارے سامنے ہیں۔یقیناً ادب اُن کے لئے کوئی عارضی شغل نہیں تھا بلکہ
ادب کو اُنھوں نے ایک طرزِ حیات کے طور پر قبول کیا۔''

''جوش صاحب شاعرِ انقلاب کے خطاب سے جانے اور پہچانے گئے اور
یہی شہرت اُنھیں پڑھنے اور سمجھنے میں رُکاوٹ بن گئی۔ بہت کم تنقید نگار اور
ادبی مورخ اِس دائرے سے نکل کر جوش شناسی کے سفر میں دوسری راہوں
کی طرف جانے میں کامیاب ہو سکے۔ اِس کتاب میں کوشش کی گئی ہے
کہ اِختصار سے سہی لیکن جوش کی تخلیقی زندگی کے تمام دروخال دامنِ
قرطاس پر اُتر سکیں۔''

جس اعتبار سے عنوانات کی تقسیم ہے اُس اعتبار سے یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب جس کا عنوان ہے ''زندگی اور تخلیقی شخصیت'' کئی ذیلی عنوانات سے پُر ہے، بہرحال اُس میں خاندانی پس منظر، طبیعت کا میلان، فطرت سے لگاؤ، شخصیت کے تضادات پر اچھی طرح سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ حیدرآباد کے سفر اور قیام کے بارے میں بھی معلوماتی باتیں ہیں۔ ذہن، مزاج اور نفسیات کا بہت اچھا تجزیہ اور محاسبہ ہے پوری باتیں مثالوں اور حوالوں کے ساتھ کہی گئی ہیں جو تحقیق کا مزاج ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء تک اچھی طرح سے چلتا ہے لیکن ۱۹۳۵ء کے بعد اچانک وہ ۱۹۵۵ء پر آجاتے ہیں جب وہ ھندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آجاتے ہیں۔ اِس درمیان کے واقعات آزادیٔ ہند کے تئیں سپردگی اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی وغیرہ پر نہ کے برابر روشنی پڑتی ہے نہ ہی تقریباً دس سال حیدرآباد کے قیام اور دارالترجمہ کی ملازمت کی تفصیل ملتی ہے جبکہ ایک خیال ہے کہ اس ملازمت کے درمیان اُن کے مطالعہ کی کثرت نے اُن کے ذہن اور وژن کو وسیع سے وسیع تر کیا لیکن تبدیلیٔ وطن کے بارے میں بہت اچھا جملہ قلم سے نکلتا ہے:

''پھر اُن کی زندگی میں ایک ایسا موڑ بھی آیا کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے ۔ آباواجداد کی قبریں ، ملیح آباد کی مٹی کی خوشبو ، لکھنوی تہذیب کا بانکپن ، ادب دوستوں کی دلنواز صحبتیں ، مہوشوں کی یاریاں ، یہاں تک کہ جواہر لال نہرو کی ناز برداریاں بھی آڑے نہ آسکیں اور وہ دہلی سے کراچی آ گئے ۔''

اس کے بعد کے حالات کا تعلق کراچی اور پاکستان سے ہے اس لئے اس کو باریکی سے پیش کیا گیا ہے ۔ ترقی اردو بورڈ سے اُن کی وابستگی اور کارکردگی ، کراچی سے وابستگی ، احباب ، افرادِ خاندان وغیرہ کے علاوہ تحقیق کی رو سے سنِ ولادت پر عمدہ و مدلل گفتگو کی گئی ہے اور کئی مثالوں اور حوالوں کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جوش کا صحیح سنِ ولادت ۱۸۹۴ء ہے جبکہ خود جوش نے ۱۸۹۸ء لکھا ہے ۔ اُس کے بعد اُن کا اصل نام ، تخلص ، صبح سے شام تک کا پروگرام غذا ، پڑھائی ، علالت اور وفات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے ۔ اِن معنوں میں یہ پہلی اہم اور کارآمد کتاب ہے ۔ جس میں شاعر آخرالزماں پر اتنی تفصیل سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ہلال نقوی خود تو اچھے محقق ہیں ہی ۔ جوش کے ساتھ اچھا خاصا وقت گذارا ہے ۔ قریب سے دیکھا ہے پھر بھی اُن کی تحقیق میں جذباتیت کہیں بھی نہیں ہے ۔ حقیقت ہے اور معروضیت ۔ اسی لئے درمیان میں ایسے ایسے جملے رقم ہوتے چلتے ہیں جو اُن کی تحقیق و تنقید ، فکر و خیال کا نچوڑ بن کر نکلتے ہیں مثلاً :

''جوش کا مسلک اور عقیدہ کچھ بھی ہو لیکن بنیادی طور پر وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں ۔ ہر بڑے انسان کی طرح انسانیت اُن کا مذہب ہے ۔ انھوں نے ہمیشہ انسانی اقدار کی بحالی کے لئے سوچا اور لکھا ۔ وہ پوری کائنات کو اپنا وطن تصور کرتے ہیں ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وطنیت پر میرا ایمان بس اس حد تک ہے کہ غاصبوں اور جابروں سے اس کو ہر حال میں محفوظ رکھا جائے ۔''

یا

''جوش ہمارا ایک عظیم تہذیبی ورثہ ہیں ۔ اُن کی توانا شخصیت ہماری ادبی
تاریخ کا ایک تخلیقی باب ہے ۔ ان کے افکار، ان کا فلسفہ تشکیک اور ان کی
زندگی کے اکثر معاملات پر ایک طبقے نے اعتراضات کی بہت بوچھار کی
لیکن وہ اپنے رویوں اور طرزِ فکر پر نہ معذرت خواں ہوئے نہ انھیں اس پر
کوئی ندامت تھی ۔ یہ اُن کے فکری ثبات کی دلیل ہے ۔''

دوسرے باب میں فنی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ۔ اس باب کی مشروعات بھی موثر ڈھنگ سے ہوتی ہے ۔ وہ جوش کی ادبی و تخلیقی زندگی کو چھ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں ۔ اس تقسیم کے جواز ہیں اور زاویے بھی ۔ اس کے بعد وہ فوراً مطالعہ سحر اور فطرت کی نقش گری پر گفتگو کرتے ہیں ۔ اس سے قبل بھی جوش کی فطرت نگاری یا منظر نگاری پر باتیں ہوئی ہیں لیکن اس انداز کی فلسفیانہ گفتگو نہ کے برابر ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ پوری اردو تنقید میں عموماً فطرت سے متعلق گفتگو مناظر اور اسلوب تک محدود رکھی گئی ہے ۔ ہلال نقوی نے اسے حیات و کائنات اور فنا و بقا سے جوڑا ہے ۔ پہلا وصف تو وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ''منظر کا غیر جامد ہونا'' یعنی وہ زندگی کا چہرا زندگی ہی کے آئینے میں دکھاتے ہیں ۔ اُن کا مصرعہ ہے:

''زندگی مڑتے ہوئے پتوں پہ بوندوں کہ کھنک''

اُس کے بعد جس انداز سے اس مصرعے کی تشریح کی ہے وہ ہلال نقوی کی تنقیدی بصیرت کی غمازی کرتی ہے اور پھر اس کی بھی تلاش کہ جوش نے منظر نگاری کے اثرات شعری سطح پر کہاں کہاں سے اخذ کئے ہیں ۔ اس تلاش میں وہ انجمنِ پنجاب، حالی، شبلی وغیرہ کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن اس کے سوتے نظیر اور انیس کے یہاں تلاش کر لیتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے ۔ کچھ اور گفتگو کرنے کے بعد وہ جلد ہی احتجاجی اور انقلابی شاعری کی طرف آجاتے ہیں ۔ ہندوستان کے سیاسی حالات پر سرسری تبصرہ کر کے شبلی کی قومی شاعری کے اثرات تلاش کرتے ہوئے مختلف مثالوں کے ذریعہ اقبال اور جوش کا تذکرہ ملتا ہے اس کے بعد براہِ راست جوش کی احتجاجی شاعری پر تبصرہ ملتا ہے ۔ یہاں بھی مثالیں ہیں اور حوالے بھی اور پھر یہ جملہ:

''جوش کی انقلابی شاعری اُن خوابوں سے عبارت ہے جن کی تعبیر میں وہ روشنی ہی روشنی، محبت ہی محبت اور ارتقاء ہی ارتقاء دیکھتے ہیں۔ انھوں نے انگریزوں سے آزادی کے جو خواب دیکھے تھے وہ اُن خوابوں کو حقیقت بنانا چاہتے تھے۔ اِس راستے کی ہر دیوار کو ہٹانے کے لئے اُنھیں کسی آہستہ خرام ندی کی لہریں نہیں سمندروں کا خروش درکار تھا۔ ایسی فضا میں جب جوش صاحب نے انقلابی نظمیں لکھیں اور پڑھیں تو انگریزوں کے خلاف جو جذبات تھے اُن میں ہیجان اور تلاطم کی بجلیاں چمکنے لگیں۔''

اس کے بعد تہذیبی وثقافتی اظہار پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے وہ پھر نظیر، انیس، غالب کا ذکر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں:

''ہماری پوری اردو شاعری کی تاریخ میں جوش سے زیادہ نظیر اکبرآبادی کا قدرداں کوئی دوسرا شاعر نہیں ملے گا۔ غالب اور انیس کی عظمت کے وہ بہت قائل ہیں لیکن نظیر کے لئے اُن کی نگاہ میں بہت وسعت ہے اور وہ اُسے اردو کا وسیع ترین شاعر قرار دیتے ہیں۔''

اس طرح سے ہلال نقوی جوش کو نظیر کی توسیع مانتے ہیں اور پھر یہ دعویٰ بھی:

''عالمی ادب میں بھی کسی شاعر نے اپنے عہد کو اس شدت کے ساتھ اپنی تخلیق کا حصہ نہیں بنایا۔ ہماری تاریخ اور ہماری زندگی کا ایسا کون سا چہرا ہے جسے جوش نے اپنی شاعری کا روپ نہ دیا ہو۔ اُن کے لفظوں میں اتنے تناظر اور اتنے چہرے ہیں کہ اُن کی شاعری ہماری تہذیبی زندگی کے سب سے بڑے البم کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔''

اس کے بعد فکری عناصر اور فلسفۂ حیات پر گفتگو شامل ہے۔ ابتدا میں ہی ایسے خوبصورت معنی خیز جملے پڑھنے کو ملتے ہیں:

''جوش اس اعتبار سے حیرت زدہ کر دینے والے شاعر ہیں کہ وہ اپنی

قادرالکلامی سے ایسی ایسی متحرک تصویریں، اتنی باتیں، اتنی کائناتیں تعمیر
کردیتے ہیں کہ چشم تماشا دیکھتی رہ جائے۔ اُن کی سوچ اُن کا پیغام ہے
جس میں سوال بھی ہے اور حیرت بھی۔ کائنات کے بارے میں جوش کا جو
ردِّعمل ہے وہ حیرت کا ردِّعمل ہے۔''

جوش پر یہ الزام ہے کہ اُن کے یہاں کوئی منضبط فکر نہیں ہے۔ مصنف نے اس کا بے حد خوبصورت
اور منطقی جواب دیا ہے اور بے حد خوبصورت جملے تراشے ہیں:

''شاعری کو محض اس پیرائے سے ناپنا کہ اُس میں پیغام کس قدر ہے اور فکر
کی مقدار کتنی ہے اور یہ کہ شاعری اسی وقت عظیم کہی جائے گی جب اُس
میں خالص فکری عوامل زیادہ ہوں۔ تنقید کی غیر جانبدارانہ تعبیرات میں یہ
بات حرف آخر نہیں کہی جا سکتی۔ زندگی کی ہزار پرتیں ہیں جن میں فکر بھی
ایک پرت ہے۔ کسی فلسفے، کسی دانشورانہ جواز، کسی بند میں تاریخی
استدلال یا کسی کتاب کی منطقی بحث کو اپنی قادرالکلامی سے شعر کی زبان تو
دی جا سکتی ہے لیکن وہ نگاہ جو بسیط المشاہدات ہو، جو ذاتی مشاہدے اور
تجزیے کی زمین پر تخمِ تخلیق کا سینہ کشادہ کرے اُس کے ثمرات حقیقتوں اور
خوابوں کی نئی تاریخ رقم کرتے ہیں۔ شاعر اپنے خیال کے لمبے سفر میں کبھی
کبھی کچھ ایسے جادے بھی طے کرتا ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کی
چھلنیوں سے گذر کر زمان و مکان کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ شعوری طور
پر اپنی فکر میں وہ مسائل پیش نہ بھی کر رہا ہو جس کا تعلق اقتصادی، سماجی اور
مدنی معاملات سے ہے لیکن اس کے تخلیقی سفر کی نامعلوم رسائی، ہر رسائی
کو اِس طرح چھونے لگتی ہے کہ شعر کے بطن سے فلسفہ جنم لینے لگتا ہے۔''

اِس ضمن میں ایک اچھا سوال بھی قائم کیا ہے:

''کیا جوش یا کسی بھی شاعر کو بحیثیت مفکر پرکھنے کے لئے ہماری تجزیاتی اور

تنقیدی بنیادیں اُنھیں اُصولوں پر قائم ہوں گی جو خالص فلسفیوں اور
مفکروں کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں؟''

اِس طرح وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ جوش بنیادی طور پر شاعر ہیں فلسفی نہیں۔ فلسفہ اُن کی شاعری میں کہیں جذبہ کہیں نظریہ بن کر بولتا ضرور ہے لیکن خشک فلسفہ بن کر نہیں۔ اِس لئے وہ بار بار کہتے ہیں کہ ہمیں مفکر جوش سے ملنے کے لئے پہلے شاعر جوش سے ذہنی رشتہ اُستوار کرنا ہوگا۔ کچھ مثالوں اور نظموں کا ذکر کرنے کے بعد وہ جوش کے احترام آدمیت اور عظمتِ انسان کے موضوع پر آجاتے ہیں جس کی ابتدا ایسے جملوں سے کرتے ہیں:

''جوش صاحب کی شاعری میں یقیناً کوئی ڈھلا ڈھلایا اور طے شدہ پیغام
نہیں ہے اور یہ اِس لئے نہیں ہے کہ وہ کسی مسلک، کسی گروہ یا کسی انجمن
کی نمائندگی نہیں کر رہے۔ انسان اُن کا موضوع ہے۔ انسانیت اُن کا
مسلک ہے۔اُن کے فکری سفر میں پوری انسانیت شریکِ سفر ہے۔''

اِس موضوع یا اِس سے ملتے جلتے موضوع مثلاً خرد افروزی، عقلیت آمیزی، مذہبی تجربہ پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔ مثالوں اور حوالوں سے اپنی گفتگو مدلّل و موثر بناتے ہیں۔ آخر میں اُن کے زبان و بیان پر بھی مختصر گفتگو کرتے ہیں اور سردار جعفری کے اِس جملہ پر اِس باب کو ختم کرتے ہیں:

''زبان و بیان کے معیار کے اعتبار سے بعض ایسے اشعار ہیں جو سعدیؔ،
رومیؔ اور حافظؔ کے دیوان میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔''

ہلال نقوی محقق کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں جس موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں اُس کی پرت پرت کھنگال ڈالتے ہیں۔ جوش کے تو صحیح معنوں میں ماہر ہیں۔ اُن کی یہ تحقیق بے مثال ہے۔ اِس کتاب کے ابتدائی حصہ اور آخر میں مضامین، کتب و رسائل کی جس طرح سے تفصیل و ترتیب دی گئی ہے اُس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے لیکن گوشۂ تنقید میں بھی جس نوع کا تجزیاتی عمل اور رویّہ اُنھوں نے اپنایا ہے وہ منطقی اور استدلالی ہے۔ جا بجا تحقیقی حوالے اِس قدر ہیں کہ کوئی بات

قیاسی اور خیالی ممکن نہیں۔ جس سے تحریر میں جذباتیت نام کو نہیں بلکہ حقیقت اور معروضیت ہی نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں تو ایسے خوبصورت اور تخلیقی جملے آگئے ہیں کہ تنقیدی بصیرت تخلیقیت میں ڈھل جاتی ہے لیکن یہ بھی ہے کہ یہ حصے مختصر ہیں انھیں اور پھیلایا جاسکتا تھا لیکن ایک پروجیکٹ کے تحت شاید اُن کی کچھ مجبوریاں بھی رہی ہوں گی پھر اُنھیں ایک ہی کتاب میں جوش جیسے کثیرالجہات شاعر کی ساری جہتیں شامل کرنی ہوں گی اِس لئے وہ تیزی سے آگے بڑھتے نظر آتے ہیں تاہم جو ہے اور جتنا ہے وہ بیحد عمدہ، معنی خیز اور فکر انگیز ہے۔

اس کے بعد اصنافِ شعر و نثر کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ غزل کے حوالے سے عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جوش غزل کے مخالف تھے لیکن یہ پورے طور پر سچ نہیں ہے۔ مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے۔ غزلیں کہتے تھے۔ روحِ ادب میں غزلیں ہیں۔ نقش و نگار اور شعلہ و شبنم میں بھی غزلیں ہیں جوش بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے لیکن غزل کے دشمن نہ تھے جیسا کہ عام طور پر سوچا جاتا ہے۔ دراصل اُن کے زمانے تک لکھنؤ میں جس انداز کی غزلیں کہی جارہی تھیں، خلوت کی خیالی شاعری ہورہی تھی جوش اُس کے ہمنوا نہ تھے اور ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ جلوت کے شاعر تھے۔ سردار جعفری کی ایک عمدہ مثال کے بعد محمد حسن کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں۔ اِس کے بعد مصنف نے خود یہ نتیجہ برآمد کیا:

> ''غزل پر جوش کے تمام تر خیالات کا دیانت دارانہ تجزیہ اِس بات کی تائید کرتا ہے کہ وہ غزل کے نہیں، غزل کی روایتی بندشوں اور حکایتِ پارینہ کے مخالف ہیں۔''

یہ تجزیہ بھی خوب ہے کہ غزل دل کی شاعری ہے اور جوش دماغ کے شاعر تھے۔ اِس کے بعد نظم، مرثیہ، رباعی پر بھی تبصرہ و تجزیہ کرتے ہیں۔ رباعیوں کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

> ''انیس سے فراق تک رباعی کے جتنے شعراء ہیں وہ موضوع کی محدودیت کا شکار رہے ہیں جبکہ جوش نے رباعی میں آفاقیت کو سمیٹ لیا ہے۔''

حرفِ آخر نظم کی حمد و نعت، منقبت و سلام، منظوم تراجم، فلمی شاعری، نثر میں لکھی گئی کتابوں کی بنیادی

اور تحقیقی اطلاعیں دی گئی ہیں جو بے حد اہم اور معلوماتی ہیں۔ اِس کے بعد تالیفات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اُن کی زندگی میں شائع ہونے والی تصانیف کا ذکر ہے اور ایسی کتابوں کے نام ہیں جنھیں جوش کے شائقین بھی نہیں جانتے۔ اِس طرح سے نثر میں بھی بعض ایسی کتابوں کے نام ہیں جن کا ذکر کم سے کم سنا گیا ہے لیکن مصنف نے ان کتابوں کے نام، سنِ اشاعت اور دیگر معلوماتی باتیں بڑے اعتماد سے پیش کی ہیں اِس کے بعد اُن انتخابات کے نام بھی پیش کیے گئے ہیں جو دوسروں نے کیے ہیں۔ اِس ضمن میں سب سے قیمتی اطلاعات اُن کے غیر مطبوعہ ادبی اثاثہ اور گمشدہ نو واردات سے متعلق ہے ہر چند کہ ہلال نقوی جوش کی نادر تحریریں کے نام سے پوری ایک کتاب ترتیب دے چکے ہیں اس کے باوجود اور بہت سی قیمتی چیزیں ہیں جو منظرِ عام پر نہیں آسکی ہیں جن میں کئی ہزار اشعار پر مشتمل نظم ''حرفِ آخر'' ہے اور ''محمل و جرس'' بھی۔ ایک خیال ہے کہ یہ جوش کا آخری شعری مجموعہ ہے۔ کچھ چیزیں اور ہیں۔ جوش خود کہتے ہیں:

> ''ایک تو وہ ہے اندیشہ وانشا (نثر) ایک ہے محراب و مضراب (نظم) محمل و جرس بھی نظم ہے اور حرفِ آخر اور معاصر و احباب جو ہنوز معرض تصنیف میں ہیں اور چھ مسدس ہیں۔''

مصنف کا خیال ہے کہ فلسفۂ اخلاق اور ذکر و فکر بھی جوش صاحب کی غیر مطبوعہ نثری کتابیں ہیں۔ اِس کے علاوہ یوسف حسین خاں کی کتاب ''روحِ اقبال'' پر جوش کے حاشیے بھی بے حد اہم چیز ہیں اور اچھی بات یہ ہے کہ یہ اب مصنف کی تحویل میں ہیں کچھ اور چیزیں ہیں جن کے ناموں کا ذکر ہے لیکن مصنف کے پاس نہیں ہیں مثلاً رباعیوں کا مجموعہ ''ایاغ و چراغ'' ''آگ'' مرثیہ ''ارتقائے خاک'' وغیرہ۔ امیر خسرو پر نظم۔ آخر میں مصنف کہتے ہیں:

> ''جوش صاحب کی ایسی لاتعداد نظمیں اور دیگر تحریریں ہیں جو ملیح آباد، لکھنؤ، دکن، دہلی، کراچی اور اسلام آباد کے علاوہ بھی دیگر شہروں اور قصبات میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں اور نگاہِ تحقیق سے اب تک اوجھل ہیں۔''

اب جب کہ ہلال نقوی جیسے ماہر جوشیات کی آنکھوں سے یہ چیزیں اوجھل ہیں تو پھر کیا اُمید کی

جائے کہ جوش کا یہ پوشیدہ اور باقی ماندہ سرمایہ منظرِ عام پر آسکے گا۔ لیکن یہ اُمید تو کی جاسکتی ہے کہ جو چیزیں دستیاب ہیں اُنھیں نئے سرے سے منزلِ اشاعت تک پہنچایا جائے ۔ جوش کے مدّاحوں اور تحقیق کاروں کے لئے یہ بڑے کام کی چیزیں ہوں گی ۔ کتاب کے آخر میں جوش پر اب تک لکھی گئی کتابوں کی فہرست بھی درج کی گئی ہے اور رسائل میں لکھے گئے مضامین کی طویل فہرست بھی جو تقریباً بائیس صفحات میں آسکی ہیں اِس کے بعد حوالہ جات اور اشارات ہیں جو ہلال نقوی کی کڑی محنت ، دیانت داری اور غیر معمولی تحقیقی شعور کا پتہ دیتے ہیں اور اِس بات کا صاف اندازہ ہوتا ہے کہ جوش شناسی کے ضمن میں اُنھوں نے کس قدر محنت اور عرق ریزی کی ہے۔ کہا جائے کہ پوری عمر لگادی تو غلط نہ ہوگا۔

☆☆☆

جوش کا شعری رنگ و آہنگ

سحر انصاری

جوش ملیح آبادی کی شاعری کا رنگ اور کلام کا آہنگ مجھے ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔ میں خود کو اس لحاظ سے بھی خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں نے بار ہا جوش صاحب کی زبان سے ان کا کلام سنا اور ان کی صحبتوں میں شریک ہونے کا شرف بھی مجھے حاصل رہا۔ میں جس قدر جوش کی شاعری کا مطالعہ کرتا جاتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جوش اردو کے تمام قدیم و جدید شعرا سے مختلف اور منفرد شاعر ہیں۔ ولی، میر تقی میر، سودا، ناسخ، آتش، میر انیس، غالب، اقبال یہاں تک کہ نظیر اکبر آبادی سے بھی جوش کا سلسلۂ سخن نہیں ملتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جوش اسی سمندر کی ایک لہر ہونے کے باوجود ساری لہروں بلکہ خود سمندر سے بھی اس قدر مختلف کیوں ہیں؟ اس سوال کا جواب جوش ملیح آبادی کی شخصیت میں مضمر ہے۔

جوش کی شخصیت کا تعین اور مطالعہ کس طرح کیا جائے کہ اُن کی تخلیقی انفرادیت کے خط و خال واضح ہو سکیں۔

سب سے پہلی بات تو خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، ذاتی افتادِ طبع اور وہ عوامل جنھیں genetic conditions سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کا خلاصہ یوں بیان ہو سکتا ہے کہ اس پس منظر نے جوش کو جری، نڈر اور بہادر بنایا تھا جس کا احساس اور اظہار وہ ساری زندگی کرتے رہے:

برسوں جھولا ہوں اُن اجداد کے گہواروں میں
صبح منہ دیکھتے تھے اُٹھ کے جوتلواروں میں

جوشؔ ملیح آبادی کی شاعری میں جو کیفیتوں اور تجربوں کی ایک برات شہنائیاں بجاتی گزرتی ہے، جس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی، وہ ان کی اسی شخصیت کا پرتو ہے جس کی تشکیل وتعمیر میں خاندانی وراثت کے عوامل کے علاوہ ذہن ودل کی وہ تربیت بھی شامل ہے جو اپنی افتادِطبع کے عین مطابق خود جوشؔ ہی نے کی تھی۔

جوشؔ کی شخصیت اور شاعری میں انتہاؤں کو چھو لینے کی کوشش ہر جگہ نظر آتی ہے۔ چنانچہ جوشؔ ملیح آبادی نے اگر ایک طرف ''حرفِ آخر'' جیسی طویل رزمیہ کے علاوہ طویل نظمیں اور مسدس بھی تخلیق کیے ہیں تو دوسری طرف ان کی بھرپور تکمیلیت کے ساتھ ساتھ رُباعی جیسی مختصر صنفِ سخن پر غایت درجے توجہ دی ہے۔ بہ اعتبارِ کمیت وکیفیت رباعی کو ایک قابلِ قدر سرمایہ بنا دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عظیم مصور جو دیواری تصاویر (Mural Paintings) کی تیاری پر قادر ہو، وہ اسی شان وشوکت سے خُرد مصوری (Miniature Painting) کا بھی ملکہ رکھتا ہو۔ یہ کمال جوشؔ پر ختم ہے۔

فارسی زبان میں رباعی کو زیادہ فروغ ملا۔ دوبیتی اور ترانہ کو بھی اس میں شامل کرلیں تو باباطاہرعیاں، ابوسعیدابوالخیر، عمرخیام، سرمد کے نام بہ طورِ خاص اہم ہیں۔ اردو کے تقریباً ہر کلاسیکی شاعر نے رباعی کہی ہے لیکن خواجہ میر درد، میر انیسؔ، مرزادبیر کے علاوہ بیسویں صدی میں جوشؔ ملیح آبادی، امجدؔ حیدرآبادی، فراقؔ گورکھ پوری، تلوک چندمحروم اس صنفِ سخن کے سربرآوردہ نمائندگان ہیں۔

جوشؔ نے رباعی کی ہیئت میں qualitative change بھی پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی ہے، مثلاً اُن کی ایک رباعی ایک پورے مختصر ترین ڈرامے یا ٹیبلو کی صورت میں ابھرتی ہے۔ اس میں پہلا مصرع ماحول یا فضا کو پیش کرتا ہے، دوسرے میں کردار کی ڈرامائی آمد (dramatic entry) پھر کرداروں کے مکالمے اور آخر میں کلائمکس پر ڈرامے کا انجام۔

ملاحظہ کیجیے:

کل رات گئے عین طرب کے ہنگام
پرتو یہ پڑا پشت سے کس کا سرِ جام
'تم کون ہو؟' 'جبریل ہوں'، 'کیوں آئے ہو؟'
''سرکار! فلک کے نام کوئی پیغام''

جوشؔ نے فطرتِ انسانی اور مظاہر فطرت کو محسوساتی اور وجدانی سطح پر اپنی شخصیت کا حصہ بنالیا تھا۔ صبح اور اس کے متعلقات ان کی ساری زندگی میں خاص اہمیت رکھتے تھے جن کا اظہار انھوں نے اپنی نثر و نظم میں جا بجا کیا ہے:

اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
میں نے جھک کر یہ کہا، ''مجھ سے کچھ ارشاد کیا''

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوشؔ شاعرِ فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرِ رومان اور شاعرِ انقلاب بھی تھے۔ ان کے رومانی کلام میں حسن و عشق کے معاملات کے ساتھ نفسیات اور جنسی جمالیات کے بھی متعدد رخ ملتے ہیں۔ انقلاب اُن کے یہاں زندگی کی جدلیات کا ایک اہم حصہ ہے۔ تغیر ہی دراصل انسانی اور کائناتی ارتقا کا بنیادی عنصر ہے۔ جوشؔ نے ہمیشہ جمود کے بجائے حرکت، تغیر اور قوت و توانائی کو اپنی فکر کا اظہاریہ بنالیا تھا۔

سیاسی مسائل اور تاریخ کے اسباق (Lessons of History) پر اُن کی نگاہ بہت گہری تھی اور وہ بہادری اور بے باکی سے اس کا اظہار کرسکتے تھے۔ ان کی نظم ''سلام اے ہٹلرِ اعظم'' سیاسی شاعری کا اہم موڑ ہے لیکن بہ وجوہ وہ اس نظم کو اپنی تخلیق ماننے سے منکر تھے۔ البتہ ایک اور اہم نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' جوشؔ ملیح آبادی کی سیاسی بصیرت کی

عکاس ہے جس میں انھوں نے سامراج پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔اس نظم کے بعض حصے سلطنتِ برطانیہ پر طنز کی بہترین مثال ہیں۔

جوشؔ نے جمالیات کو اپنی شاعری اور تخلیقی عمل میں بنیادی اہمیت دی ہے۔

برہنہ پا ہو تو ہر نقش پا گلابی ہے
یہ کس کے نقشِ قدم سے زمیں گلابی ہے

جیسے مصرعوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی جمالیاتی حس کس قدر بیدار اور لطیف تھی۔ جوشؔ نے جمالیات کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) جمالی پہلو (۲) جلالی پہلو (۳) زوالِ جمال۔ مؤخر الذکر موضوعِ فکر کے بارے میں خود جوشؔ کا کہنا ہے کہ میں پہلا شاعر ہوں جس نے حسن کے انحطاط اور زوال کو شاعری کا موضوع بنایا۔اس خصوص میں ہمیں فرانسیسی شاعر بودلیئر(Baudilaire) اور ڈچ مصور وان گو(Van Gog) یاد آتے ہیں۔جس طرح بودلیئر نے ''بدی کے پھول'' لکھ کر بدی کو بھی جمالیاتی تجربہ بنانے کی کوشش کی اور وان گو نے معروض (Object) کے حسن و ترتیب کو اہمیت دینے کے بجائے اظہار (Expression) کو اپنے فن کی شناخت بنایا، اسی طرح جوشؔ نے خصوصاً اپنی رباعیات میں جمالیات کے وقت گزیدہ رُخ کو بہ طریق احسن پیش کیا ہے۔

جوشؔ صاحب خود فرماتے ہیں:

جوانی کے تلخ و شریں عشق پر تو ہزاروں دیوان موجود ہیں لیکن وقت گزیدہ عشق پر غالباً اب تک کسی شاعر نے قلم نہیں اٹھایا ہے۔شاید میں پہل کر رہا ہوں۔لیکن اس شرمندگی کے ساتھ کہ میرے دل پر جو بیت چکی اور بیت رہی ہے، اس کا کروڑواں حصہ بھی سپردِ قلم نہیں کر سکا ہوں۔

جوشؔ آبادی کا یہ تاسف حق بہ جانب اور فطری ہے۔غالبؔ جیسا شاعر بھی یہ کہہ کر رہ گیا:

اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

غروبِ جمال اور حسن کی وقت گزیدگی کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے جو واقعی سفاک بھی

معلوم ہوتی ہیں اور اندوہ ناک بھی لیکن یہ وقت کا جبر ہے جس سے بہ قولِ جوشؔ، ''چاہنے والے کا چہرہ اُدھڑ اور محبوبہ کا مکھڑا اُجڑ جاتا ہے

پہلے تو ہوا غروب میرا چہرہ
پھر یارِ قمر جبیں کا اُترا چہرہ
شاید، مرے چہرے کو منانے کے لیے
اُس شوخ نے بھیجا ہے خود اپنا چہرہ

تم خاتمِ ہستی پہ نگیں تھیں اک روز
آشوبِ دل و فتنۂ دیں تھیں اک روز
آواز سے اب تک یہ پتا چلتا ہے
تم کتنی خطر ناک حسیں تھیں اک روز

مجمر میں اگر تھا کل، اور اب آگ پہ لاکھ
اب شمع نہ پروانہ فقط موم اور راکھ
اے دورِ فلک یہ دن دکھایا تو نے
دنیا برکھا تھی کل، اور اب ہے بیساکھ

چہرے ہیں اداس اداس، گم صم طرفین
اچھا ہے کہ اندھی ہی رہے پیت کی رین
لہجوں ہی سے دیکھیں گے ہم اک دوسرے کو
آئے نہ چراغ اب ہمارے مابین

موضوع کے لطیف، نازک اور انتہائی تجریدی ہونے کی مناسبت کو جس طرح جوشؔ اپنی

لفظیات میں سنبھال لیتے ہیں، اس کی مثال عالمی سطح کے شعرا کے یہاں بھی کم ملتی ہے اُن کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے:

آواز کو آنکھوں سے دکھا دیتا ہوں

مجھ سا کوئی مے کدے میں ہے بھی ساقی
جس میں ہو گرج بھی اور لَے بھی ساقی
میرے لہجے کے، طُرفہ زیر و بم سے
چھنتا ہے لہو بھی، رنگِ مے بھی ساقی

جوشؔ ملیح آبادی تعقل اور خرد افروزی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کا متجسس ذہن سائنس اور فلسفے کے رموز و نکات جاننے کے لیے بے تاب رہتا تھا میں نے انھیں کئی اور کتابوں کے علاوہ برٹرینڈ رسل کی ''ابجدِ اضافیت'' (ABC of Relativity) کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتے دیکھا ہے۔ ''الہام و افکار'' میں جو رباعیات کے مجموعے ''نجوم و جواہر'' کے ساتھ ہی پہلی بار شائع ہوئی تھی، ''موجد و مفکر''، جیسی نظم کے مطالعے سے جوش کے سائنسی شعور اور فکری طرزِ احساس کا اندازہ ہو سکتا ہے:

ذرّے کو ہتھیلی پہ جو پل بھر رکھا
محسوس ہوا نظام شمسی کا دباؤ

جب غرفۂ عقل و ہوش کھولا میں نے
اپنے کو نئے باٹ سے تولا میں نے
میں ہوں کہ نہیں، یہ دیکھنے کی خاطر
اپنے کو کئی بار ٹٹولا میں نے

ہر بام ہے، اک کشورِ دیگر کا علم
ہر نام ہے اک رایتِ نو کا پرچم
ہر فرد ہے، اک جدا نظامِ شمسی
عالَم میں بسے ہوئے ہیں لاکھوں عالَم

کائناتِ اصغر (Microcosm) اور کائنات اکبر (Macrocosm) کا یہ شعور جوشؔ کی شاعری میں جا بہ جا جھلکتا ہے۔

یہ اور اس طرح کی دیگر تجربہ آمیز رباعیات خود رباعی کی صنف میں جوشؔ ملیح آبادی کی جانب سے تخلیقی اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جہاں تک جوشؔ کی زبان، تراکیب اور اندازِ نگارش کا تعلق ہے، جوشؔ کی رباعیات میں بھی وہ ساری لسانی خوبیاں اور تجربے نظر آتے ہیں جو اُن کی عموی شاعری کی پہچان ہے۔ وہ ثقہ، ٹکسالی، بامحاورہ زبان کے شائستہ پیرایوں کو برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں اور کرداروں نیز موضوعات کی سچی اور حقیقی تصویر کشی کے لیے غیر ثقہ الفاظ اور بولی ٹھولی سے کام لینا بھی جانتے ہیں۔ جوشؔ کا یہی ہنر اُن کی شاعری کے تنوع کو دھنک کے رنگوں سے بھی ماورا لے جاتا ہے جہاں بالائے بنفشی (UltraViolet) اور زیریں سرخ (Infra Red) تک پہنچنے کے لیے دور بین کے عدسے کی نہیں، نگاہِ دور بیں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لفظوں کی اندرونی ساخت (Deep Structure) تک پہنچے بغیر معنی کے معنی (Meaning of meaning) تک رسائی ممکن نہیں:

الفاظ کے سر پر نہیں اڑتے معنیٰ
الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھو

تلوار کو لچکاؤں، تو مرہم ٹپکے
مرمر کو فشار دوں تو زم زم ٹپکے

بخشا ہے تخیل نے، وہ اعجاز مجھے
شعلے کو نچوڑ دوں تو شبنم ٹپکے

انسان اور خدا، نیز کائنات کو جوشؔ کبھی ایک اکائی کی شکل میں دیکھتے ہیں اور ان کا نقطۂ نظر کلیاتی (Holistic) ہو جاتا ہے اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ جوشؔ ''فرد'' پر اپنے طنز کے تیر آزمارہے ہیں لیکن دراصل اُن کا ہدف کوئی ''فرد'' نہیں بلکہ ادارے ہوتے ہیں جن کی نمائندگی ایسے افراد کرتے ہیں جن سے معاشرے میں غلط بخشی، عدم مساوات، انصاف شکنی، افلاس، بھوک اور ناداری جیسے ناسور جنم لیتے ہیں۔ پھر ظلم اور ناانصافی کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مکافاتِ عمل کے طور پر کیا کیا مظاہر رونما ہوتے ہیں:

ہر قہر ہے، قاہر کے لیے تختۂ دار
ہر ظلم ہے، ظالم ہی کے حق میں آزار
دل توڑنے والوں کو یہ معلوم نہیں
ٹوٹے شیشوں سے جھانکتی ہے تلوار

ہر نقص ہے، دل شکستگی کی تمہید
ہر ضعف ہے، اک خازنِ گم کردہ کلید
آزار رسانی ہی نہیں فعلِ قبیح
آزار کشیدگی بھی ہے جرم شدید

جوشؔ نے تہذیب کے مختلف گوشوں اور ان سے وابستہ شخصیات پر بھی غیر معمولی فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ اُن کے الفاظ کی چلمن سے پاک و ہند کی تہذیب جھانکتی دکھائی دیتی ہے:

یہ خفتہ فضا پہ خط ابیض کا نکھار
دوشِ انوار پر یہ مینا بازار
یہ صبح کی پیشواز، گنگا جمنی

الوان کی بدلی سے یہ راگوں کی پھوار

دنیا کے ہر بڑے شاعر اور مفکر کی طرح جوشؔ کے شاعرانہ اور مفکرانہ نظام میں وقت کی بہت اہمیت ہے۔ ارضی وقت کو تو جوشؔ نے عملاً برت کر اپنی زندگی میں ثابت کر دیا کہ ان کا شعورِ وقت محض نظریہ نہیں بلکہ اسلوبِ حیات کا لازمی عنصر ہے اسی طرح وہ کائناتی وقت کی تغیر پذیری اور اضافیت کو بھی اپنی شاعری میں موقع محل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جہاں وقت کی فنا خیزی کا محل ہے، وہاں جوشؔ کی رباعیات میں طنز بھی ہے تاسف بھی۔ اور جس جگہ وقت کو تاریخ کے تناظر میں دیکھنا اور دکھانا مقصود ہوتا ہے وہاں جوشؔ کے لہجے میں قطعیت اور کلید سازی کی رمق پیدا ہو جاتی ہے:

دانا ہے تو وقتِ گزراں کو پہچان
صدیوں کو اٹھائے پھر رہی ہے ہر آن
چپ چاپ گزر رہے ہیں، تاریخ بدوش
لمحوں کے لباس میں کروروں انسان

منٹ ساٹھ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔ اس کا شاعرانہ اظہار ''ساٹھ نگینوں کا بلوریں کنگن'' کی صورت میں کیا ہے:

اے شب گزو، روز کوب ولمحات شکن
ایک ایک دقیقے میں ہیں لاکھوں گلشن
نادان کہیں ٹوٹ نہ جائے، ہشیار!
یہ ساٹھ نگینوں کا بلوریں کنگن

اٹھ ساغرِ شب، جھلک رہا ہے ساقی
فرصت کا سبو، درک رہا ہے ساقی
سن، بال کمانی کی، خدارا ٹک ٹک

یہ وقت کا دل دھڑک رہاہے ساقی

کسی شاعر یا فن کار کی عظمت کا تعین کیلنڈر کے اوراق کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا۔ شاعر اگر خود ایک روایت کا legend بننے کی صلاحیت رکھتا ہے تو کسی پروپگنڈے، تعصب یا سرکاری درباری سرپرستی کے بغیر بھی جریدۂ عالم پر دوام کی مہر ثبت کرسکتا ہے۔ جوشؔ کی شاعری اور شخصیت پر مدح وقدح کی دھوپ چھاؤں برابر پڑتی رہی ہے۔لیکن جوشؔ اپنے بل پر روشن سے روشن تر ہوتے جارہے ہیں۔اس کا سب سے بڑا سبب اہم اور عہد ساز آوازوں کو ازسرِ نو تلاش کرنے کی ادبی ضرورت بھی ہے۔ مغرب میں بھی یہی سوال اٹھایا جارہا ہے کہ امریکا میں رابرٹ فراسٹ اور کارلوس ولیمز کارلوس جیسے شعرا کے بعد اور انگلستان میں آڈن، اسپنڈر، یہاں تک کہ ٹیڈ ہیوز اور فلپ لارکن کے بعد کون؟ سمس ہینی کو نوبیل انعام ملا تو بیشتر دنیا حیران رہ گئی کہ یہ کون صاحب ہیں؟ نتیجہ یہ کہ پھر ڈی ایچ لارنس اور برنارڈ شا کی طرف نیز ییٹس، ایلیٹ اور لوئی میک نیس کی سمت دوبارہ نظریں اُٹھنے لگیں۔ جوشؔ کی بازیافت یا قدر افزائی ایسے ہی عمل کا نتیجہ ہے۔ جوشؔ بعض دیگر اکابر شعرا کی طرح توہم شکنی، روایت کے بجائے درایت، انسان دوستی، امن واخوت کا ایک استعارہ بن چکے ہیں، جو اذہان ان اقدار کے چراغوں سے ایوان تمدن کو جگمگانا چاہتے ہیں، وہ ضرور جوشؔ ملیح آبادی کی ہم نوائی کریں گے:

ادب کر اُس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ وہ اپنی صدی کا حافظ وخیام ہے ساقی

☆☆☆

چاکِ داماں پہ نثار
جوش کی شاعری پر چند باتیں

مبین مرزا

جوش کی شاعری اور اُن کے ادبی مقام و مرتبے کے بارے میں حتمی طور پر ہم خواہ کسی بھی رائے کا اظہار کریں لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ جوش ایک منفرد شاعر ہیں اور یہ انفرادیت محض کسی ایک آدھ وجہ سے اُن کے حصے میں نہیں آئی بلکہ اس کی متعدد وجوہ ہیں، مثلاً یہ کہ اُنھوں نے اپنے شعری تناظر میں جن موضوعات پر توجہ کی ہے ان میں کچھ صرف انھیں سے مخصوص نظر آتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ بعض موضوعات جو اِس سے قبل ہمارے بڑے شعرا کی توجہ کا مرکز رہے اُن کی طرف جوش کا رویہ اپنے متقدمین سے اِس حد تک بھی مختلف رہا کہ جوش کی شاعری میں وہ موضوعات اپنی نئی جہات کے ساتھ معرضِ اظہار میں آئے ہیں اس کے علاوہ جوش کا رنگِ سخن، آہنگ سخن، آہنگِ بیان اور اسلوبِ اظہار اپنے جو پیرایے تراشتا رہا ہے اگر اُسے دیکھا جائے تو ماہیت ہی میں نہیں بلکہ کیفیت و کم میں بھی یہاں انفرادی شان اپنی آب و تاب دکھاتی ہے ان سب فکری و فنی پہلوؤں کے ساتھ ہی ساتھ اسالیب فن پر جوش کی گرفت الگ سے ہماری توجہ حاصل کرتی ہے۔ غرض یہ کہ ایک نہیں کئی ایک عوامل کی بنیاد پر جوش کا جہانِ شعر و سخن لائقِ مطالعہ ٹھہرتا اور اپنے اہم نشانات کا اثبات چاہتا ہے۔

اب یہ کہنا تو خیر درست نہ ہوگا کہ ہماری تنقید نے جوش پر جو کام کیا ہے، اُس میں ان کا حق ادا نہیں ہو سکا ایسا تو بہر حال نہیں ہے۔ جوش کے اچھے تنقیدی مطالعے کئی زاویوں سے اب

تک سامنے آچکے ہیں۔تاہم اس امر کے اعتراف میں بھی ہمیں تامل نہیں کرنا چاہیے کہ آج جوش کے ایک نئے مطالعے کی ضرورت اگر محسوس کی جارہی ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ جوش کے فکرو فن کے بعض پہلو ابھی تشنۂ کلام ہیں۔خیر، یہ کوئی ایسی تعجب خیز بات بھی نہیں ہے اس لیے کہ ہر اہم تخلیق کار کے فکروفن کے بعض پہلو بدلتے ہوئے زمانی دائروں میں نئے حوالوں یا سوالوں کے ساتھ گفتگو طلب ہوا ہی کرتے ہیں، بشرطیکہ زمانے کے بدلتے تناظر میں اپنی تہذیب اور ادب سے اُس فن کار کا زندہ رشتہ قائم رہے اور نئے عہد کے مباحث ومسائل سے مخاطبے (discourse) کی اس میں سکت پائی جائے۔اچھا، اب یہ جو سکت پائی جانے والی بات کہی گئی ہے، اس سے ہمیں یوں ہی سرسری نہیں گزرنا چاہیے بلکہ اس اجمال کو اگر ذرا سی تفصیل میں دیکھ لیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔اس بات پر دو پہلوؤں سے غور کیا جاسکتا ہے۔

اوّل اس طرح سے کہ دیکھا جائے، زیرِ بحث تخلیق کار کے کام کو اس کی زبان وادب کے مسلمات میں شمار کیا جاسکتا ہے، یا یہ کہ اُسے کلاسیک کا درجہ مل سکتا ہے یا نہیں؟ اگر مل سکتا ہے تو اس سے آگے کی منزل بہت آسان ہوگئی۔اب تو بس یہ ہے کہ اُس کے فنی اوصاف اور تخلیقی خصائص کو دیکھا جائے اور ان پر بات کی جائے۔ظاہر ہے کہ اُس کا مسلمات میں شامل ہونا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ تغیراتِ زمانہ کے باوصف تخلیق کار کا اپنے زبان وادب سے رشتہ استوار ہے، اُس نے اپنی نگارشات میں مستقل اہمیت کی اقدار سے سروکار رکھا ہے اور ان سوالوں کو اپنے ادب میں مخاطب کیا ہے جو صرف اُس کے عہد ہی سے نہیں بلکہ آئندہ زمانوں سے بھی ایک elementary coherence رکھتے ہیں۔مجھے یہ تو بے شک تسلیم ہے کہ دانش وری کے اظہار کے لیے اِس نوع کے مطالعے میں یقیناً بہت امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن میری طبیعت اس اندازِ نقد سے گریزاں ہے۔اور اس کا سبب یہ ہے کہ اِس کے پیچھے مجھے مدرّسانہ بقراطی کا وہی طنطنہ محسوس ہوتا ہے جو نتائج پہلے اخذ کرتا ہے اور فن پارے سے اپنے موقف کے حق میں شہادتیں بعد کو حاصل کرتا ہے۔سو دانش وروں کے اس تیر بہ ہدف نسخے کو تو میں یہیں چھوڑتا ہوں۔

مطالعے کا دوسرا رخ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے تمام تر تحفظات، ترجیحات اور تعصّبات کو

معطل کرتے ہوئے اس تخلیق کار کو، جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں، زمانوں کے تناظرات میں اُٹھنے والے تہذیبی اور انسانی سوالوں کا سامنا کرنے دیں۔ یوں ہمارے عہد تک اُس کی اگر واقعی کوئی relevance ہے تو نہ صرف وہ طے ہو جائے گی بلکہ اُن دائمی انسانی اقدار کا تعین بھی ہو جائے گا جن سے اُس کے فکر و فن کو روشنی اور معنی حاصل ہوتے ہیں۔ تب اس کی تخلیقات کے تخمین و ظن اور اس کے ادبی مقام و مرتبے کے لیے ہمیں مستعار یا مفروضہ اُصولوں اور ضابطوں سے کام نہیں لینا پڑے گا بلکہ خود تہذیب و ادب کی میزان اس کام کے لیے ہمیں میسر ہو گی۔ اس نوع کے مطالعاتی منہاج سے مجھے کچھ طبعی مناسبت ہے، سو جوش کے زیرِ نظر مطالعے میں اسی کو بروئے کار لایا جائے گا۔

معاصر ادب کی جس نسل سے میرا تعلق ہے اُس نے جوش صاحب کے معاشقوں تضادات، شخصیت کے گرد بنے ہوئے نیم رومانی ہالے، ان کی الحاد پرستی اور ترقی پسندی وغیرہ میں سے کسی کا خاطر خواہ اثر نہیں لیا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اثر لینا تو بہت دور کی بات ہے، ہم نے تو ان قصوں کو سنجیدگی تک سے نہیں لیا۔ حالانکہ ایک زمانے تک، ایک طویل زمانے تک جوش صاحب کی شخصیت ہی نہیں اُن کی شاعری بھی انھیں حوالوں کے ساتھ گفتگو کا موضوع بنتی رہی تھی۔ اور یہ بھی ماننے والی بات ہے کہ اور کچھ نہ سہی تو کم سے کم ان کی الحاد پرستی اور اور ان کے تضادات (فکری یا تخلیقی سطح پر ہی نہیں شخصی سطح پر بھی) یہ دو پہلو تو ضرور ایسے ہو سکتے ہیں کہ اِن سے یوں ہی بے وجہ بھی دلچسپی لی جائے۔ اس لیے کہ ان کو سمجھنے اور ان کی گرہیں کھولنے کا فائدہ ہمیں دونوں حوالوں سے ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہم اُس دُوئی کی کنہ تک پہنچ سکتے ہیں جسے اُن کے نقادوں ہی نے نہیں بلکہ خود جوش صاحب نے بھی اپنے اندر شبیر حسن خاں اور جوش کی کشاکش سے تعبیر کیا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم جوش کی شاعری کے مرکزی مسئلے کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ بہر حال یہ مسائل جوش کے فکر و فن پر کس طور اثر انداز ہوئے، اس کی بابت اشارے آگے چل کر اپنے مقام پر آئیں گے۔ اِس وقت ہم یہ بات کر رہے ہیں کہ اپنے متقدمین کے برعکس میری نسل کے لوگوں نے اُن معاملات و مسائل کو مطلق درخورِ اعتنا نہیں جانا جنھیں ایک زمانے میں بڑی شد و مد کے ساتھ جوش

صاحب سے نسبت تھی اور اُس دور میں جوش کی نفی کرنے والے ہی نہیں بلکہ اُن کا اثبات کرنے والے بھی جن کے بغیر لقمہ توڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اب پہلے تو اسی سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر یہ نسل اور اس کے بعد والے ان بحثوں سے کیوں متاثر نہ ہوئے؟

دیکھیے وہ جو کہا جاتا ہے کہ کسی تخلیق کار کی رخصت کے بیس تیس برس بعد اُس کی نئی تفہیم اور تعین قدر کا آغاز ہوتا ہے، تو اس بیان کو سراسر تنقید کا ضابطہ فوج داری نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایک اعتبار سے یہ بات درست ہے۔ گو ہم اسے کوئی فارمولا بنا کر ادب و نقد پر اس کا اطلاق نہیں کر سکتے ہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہر تخلیق کار کے سلسلے میں یہ اصول ہمارے لیے کچھ ایسا مفید مطلب بھی ثابت نہیں ہوتا۔ تاہم کم سے کم جوش ایسے فن کاروں کے مطالعے میں اس کی صداقت اور اہمیت کا ہمیں تجربہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ جوش ایسے فن کاروں کے گرد اُن کی شخصیت، زمانے کے مزاج اور حالات کے کے زیر اثر وہ جو افسانہ و افسوں کا ایک جال سا بُن جاتا ہے، وقت کی تند و تیز ہوائیں اُسے اپنے ساتھ اڑا لے جاتی ہیں۔ وہ جو ایک قسم کی چکا چوند کسی فن کار کے گرد غیر ادبی وجوہ کی بنا پر پیدا ہو جاتی ہے، اُسے عام طور سے وقت کا عمل ہی ختم کرتا ہے اور فن کار کو اُس کے اپنے اصل رنگ میں سامنے لاتا ہے۔ تو میری نسل کے لوگوں نے جوش صاحب کو ابتداً چاہے اس چکا چوند میں دیکھا ہو لیکن اس کے خیرہ کن اثرات ہم میں سے شاید کم، بہت ہی کم ذہنوں پر رہے ہوں گے اور وہ بھی بے حد مختصر وقت کے لیے۔ چنانچہ ہم نے نسبتاً سہولت کے ساتھ اور جلدی جوش صاحب کو محض ایک شاعر کی حیثیت سے پڑھنا اور دیکھنا سیکھ لیا۔

آغازِ کلام میں یہ بات کہنے کا مقصد ایسے کسی اِدّعا کا اظہار ہرگز نہیں ہے کہ بعد کی نسل کے لوگ جوش صاحب کی بہتر تفہیم رکھتے ہیں یا اُن کا محاکمہ بہتر انداز سے کر سکتے ہیں اصل میں یہ بات مجھے یوں کہنا پڑی کہ اب تک جوش صاحب پر بعض لکھنے والے ان کے فن کی سب سے بڑی داد یہ سمجھتے ہیں کہ اُنھیں ڈھلے ڈھلائے مصرعوں، تراشیدہ تراکیب، آراستہ بیان اور ٹکسالی زبان کا بادشاہ بتایا جائے۔ ٹھیک ہے، شعر و سخن میں اِس طرح کی ہنر مندی بھی لائقِ ستائش ہوتی ہے لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کیا صرف انھیں باتوں کی بنیاد پر کسی فن کار کو عظمت اور بڑائی کا درجہ دلایا

جاسکتا ہے؟ نہیں، کم سے کم آج ہرگز نہیں۔ ان میں سے کوئی شے آج جوش صاحب کی قدر و منزلت کی اہم دلیل نہیں بن سکتی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جوش صاحب کی گرہ میں صرف یہی کچھ نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔

جوش ہماری نظمیہ شاعری کا ایک بڑا اسنگِ میل ہیں۔ جس زمانے میں جوش نے اپنا فنی سفر طے کیا، اس میں جوش کی اہمیت پر اس پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کوئی آسان دور نہیں تھا۔ اقبال کے عہد میں اس کے اثر سے نکل کر پنپنا اُن کی تخلیقی نمو پذیری اور فکری قوت کا بیّن ثبوت ہے۔ یہاں ہم اُن کی اقبال اور غزل شکنی کی بحث نہیں چھیڑیں گے۔ اس لیے کہ اوّل تو یہ بحث پامالی کی حد کو پہنچ چکی ہے۔ دوم اگر اس نکتے پر غور کرنا ضروری ہو کہ اقبال اور غزل سے جوش کی دُوری کیا معنی رکھتی ہے تو اس پر الگ سے گفتگو کرنا مناسب ہوگا۔ یہاں ہمیں صرف اتنی بات سمجھ لینی چاہیے کہ جوش کے یہاں نظموں کے سانچے میں غزل کی ہیئت یا فارم بہر حال پائی جاتی ہے۔ اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ جوش کا ردِ عمل غزل کی ہیئت کے خلاف نہیں بلکہ اس کے موضوع و مواد کے سلسلے میں تھا۔ ہاں اقبال اور جوش کا معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ یہاں اختلاف کی شکل مختلف ہے اور بنیاد گہری۔ اِکاّ دُکا مثالوں سے صرف نظر کرتے ہوئے تقاضائے بشریت کو فراموش نہ کیا جائے تو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ جوش نے اقبال کا نہ صرف سنجیدگی سے مطالعہ کیا، بلکہ اُس کا اثر بھی لیا۔ جوش کے جہانِ فن کی تعمیر و تشکیل میں یہ اثر بروئے کار بھی آیا ہے۔ جوش کے موضوعات اور ان کی طرف جوش کے رویے کے تعین میں اس اثر کی مثالیں آسانی سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اوائل ہی میں جوش کے یہاں یہ مسابقت پیدا نہ ہوتی تو عین ممکن تھا کہ جوش نرے روایتی اور رومانی شاعر کی حیثیت سے اوپر ہی نہ اٹھ پاتے۔

جوش کے فکر و نظر کی تگ و تاز کو اقبال نے مہمیز دی ہے۔ صرف خدا ہی کے موضوع کو دیکھ لیجیے۔ اقبال اس سمت گئے تو خدا کے اثبات اور خودی کی منزل تک پہنچے اور جوش نے خدا کی نفی اور زمانوں، جہانوں اور انسانوں کے اثبات کے دشت و دمن کو کھنگالا۔ تشکیک اقبال کی کشتِ

ذہن میں بھی بیج ڈالتی ہے لیکن یہاں نمو پذیری نہیں ہوتی۔ یہ مسئلہ اقبال کے یہاں کسی بڑی دوادوش کے بغیر حل ہو جاتا ہے تشکیک کے بیج کو نمو ملتی ہے جوش کے یہاں، جہاں وہ الحاد کے برگ و بار لاتا ہے اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جوش کو اپنی آواز میسر آتی ہے خالص انسانی آواز۔ ازل گیر و ابد تاب۔ اقبال نے جن مباحث کو اس باب میں اضطراب کی سطح پر محسوس کیا، جوش نے انھیں اذیت والم کے تجربے سے جاننے کی کوشش کی اقبال نے جن گرہوں کو اپنی روح کے اندر کھول کر اطمینان کی منزل پالی تھی، جوش نے ان سب عقدوں کو وجودی سطح پر سمجھنے کی جستجو کی اور اپنے لیے اطمینان کی جگہ کرب کا انتخاب کیا۔ اقبال سوالوں سے نکلے تو آرام سے سیدھے خدا تک جا پہنچے۔ جوش سوالوں میں پڑے تو یوں کہ خدا تک پہنچنا آسان نہ رہا۔ راہ دشوار ہوئی، پُر خار ہوئی لیکن (اور یہ لیکن غور طلب ہے) منزل جوش کی بھی کھوٹی نہیں ہوئی۔ کیوں کھوٹی نہ ہوئی اس پر ہم ابھی آگے چل کر بات کریں گے۔ خیر، تو یہاں موازنۂ اقبال اور جوش مرتب کرنے کا میں کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ مدرسوں کا کام ہے اور انھیں کو زیب دیتا ہے۔ خدا کے موضوع پر اقبال اور جوش کے ان حوالوں کو یوں بین الطرفین بیان کرنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ یار لوگ چاہے کچھ کہتے رہیں، جوش، اقبال کا ردیا نفی نہیں ہیں۔ یہاں اگر تطبیق کا رشتہ نہیں ہے تو تنسیخ کا بھی نہیں ہے۔ یہ تو جستجو کا سفر ہے۔ پیاسے کے چشمۂ آبِ بقا تک پہنچنے کے بھی اپنے معانی و معارف ہیں لیکن ہر پیاسے کی تقدیر یہی کیوں ہو کہ وہ چشمۂ آب بقا تک پہنچے۔ کوئی چاہِ بابل یا چاہِ نخشب کی خبر کیوں نہ لائے، یعنی کوئی جوش کیوں نہ بنے۔ آخر اس کھونٹ کی سیر بھی تو کسی نہ کسی کو کرنی ہی چاہیے۔

تو اب یہ ہے کہ جوں جوں ہم جوش کے یہاں وجودِ باری تعالیٰ کی بابت تشکیک کے مسئلے پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہی وہ مسئلہ ہے جو کہ جوش کے جہان سخن میں داخلے کی کلید ہے۔ یہ جوش کی شاعری کا بنیادی یا مرکزی مسئلہ ہے۔ اُن کی شاعری میں اور جو بھی مسائل آئے ہیں وہ سب اسی مسئلے کے تحت آئے ہیں۔ جوش کا خدا سے جو رشتہ ہے وہ اگر ایک طرف انسانی زندگی کے آزار کی بابت سوال اٹھاتا ہے، اس کے مصائب و آلام پر صبر و شکر کے بجائے آہ بکا کو انسان کا فطری مقتضا جانتا ہے، خیر و شر کے مسئلے پر الجھتا ہے کہ آخر ان میں سے کیا

فطرتِ انسانی کا اصل داعیہ ہے؟ جبر و قدر کے بارے میں سوچتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ تقدیر اٹل کیوں ہے اور اگر اٹل ہے تو پھر انسانی اختیار کیا اور اس کی جواب دہی چہ معنی؟ تو دوسری طرف خدا سے انسان کے اسی رشتے کی روشنی میں یہاں انسان کے کائنات سے رشتے اور انسان کے انسان سے رشتے کی صورتیں وضع ہوتی ہیں۔ اِس کائنات رنگ و بو کی ماہیت، اس کا آغاز و انجام، اس میں بسنے والوں کے مسائل، آلام اور حالات و حقائق، ان کی زندگی میں خدا کا کردار۔۔۔اور پھر ان کے آپس کے تعلقات، مختار و مجبور کی الگ الگ دنیائیں، متغیر حقیقتیں، سچائی کی منقلب شکلیں، اُن کے دلوں کا میل اور جسموں کی لذتیں، خیال کی لطافت اور عمل کی کثافت کے بارے میں سوالوں کا سلسلہ اور سوچ بچار کی دھونکنی سی جو ہمیں جوش کے یہاں مسلسل چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو اس کے پس منظر میں بھی جوش کے خدا سے رشتے کا مسئلہ کارفرما ہے۔

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جوش کی شاعری اصل میں سوالوں کا ایک مسلسل جاری و ساری عمل ہے۔ جستجو، تڑپ، حزن و ملال اور رنج و اشتعال سے آمیز پیہم ایک سلسلہ۔ لیکن سوالوں کا یہ سلسلہ کسی سالک یا سائل کے کسی داخلی چشمۂ تجسّس سے جاری نہیں ہوا ہے جوش کے یہاں۔ سوال در سوال اور شاخ در شاخ پھیلتی اس تڑپ کو جاننے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آبیاری تو تخلیقی وجدان کی آگہی و بصیرت کے سوتوں سے ہو رہی ہے۔ دیکھیے بات یہ ہے کہ یوں تو ساری آوازوں کا مخرج بے شک گلا ہی ہوتا ہے لیکن کچھ آوازوں کا منبع اندر کہیں دل و جگر میں ہوا کرتا ہے۔ وہ کہیں گہرائی سے آیا کرتی ہیں۔ انھیں محض آواز کہہ دینا یا سمجھ لینا کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ یہ کہیں علامت ہوتی ہیں، کہیں اشارہ اور کہیں کنایہ۔۔۔ کہیں اظہار ہوتی ہیں، کہیں استفسار اور کہیں احتجاج۔

فکر کو مہمیز دینے اور احساس کی کیفیت کو متغیر کرنے والے دوسرے شاعروں کی طرح جوش کی شاعرانہ آواز میں بھی وہ کھنک، گرج اور کھرا پن ہے جو صرف اُن کے شعری لحن کو دوسروں سے ممتاز ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ اُن کے کلام کی ترسیل معنی میں بھی ایک کردار ادا کرتا ہے۔ جوش کو ان کے طنطنے کی داد تو ہماری تنقید نے بہت دی ہے لیکن سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی

کہ یہ طنطنہ صرف شاعر کی دھاک اور شعر کی گونج بڑھانے کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ اُس شاعری کی نحوی ضرورت اور معنوی ترکیب کے سراسر داخلی مطالبے سے مرکب ہے۔ یہ آواز جوش کی شاعری کے ابلاغ میں ایک کردار ادا کرتی ہے۔ اگر آواز کا روپ بدل جائے تو اس شاعری کی تاثیر میں فرق پڑے گا۔ مثال کے طور پر جوش کے کلام کو مجاز، جاں نثار اختر، اور اختر شیرانی کو تو چھوڑیے کہ انھیں تو صرف ''رومانیے'' کہہ کر الگ کیا جا سکتا ہے، اگر فراق و فیض کی آواز میں پڑھا کر دیکھا جائے تو بھی کچھ یوں معلوم ہوگا کہ پڑھنے والے کی آواز دھوکا دے رہی ہے۔۔۔ اور پہچاننے والوں کو ذرا دقت نہ ہوگی پہچاننے میں کہ کلام زبانِ غیر سے ادا ہو رہا ہے، اس لیے معنی میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ یہ ہے جوش کے طنطنے اور لہجے کی گرج کا مقصد جو اسے معنی عطا کرتا ہے۔

جوش کی شاعری میں جو آواز ہم سنتے ہیں اُس میں اظہار، استفسار اور احتجاج کے تینوں روپ ابھرتے ہیں۔ کبھی ایک لَے اونچی ہوتی ہے اور کبھی دوسری۔ کبھی جذبے کی شدت کے زیر اثر اظہار کی لَے اونچی ہوتی ہے تو کبھی عقل کے تحت استفسار کی تان بلند ہوتی چلی جاتی ہے اور کبھی انسانی انا اور وجودی اضطراب مل کر احتجاج کے سُر میں ڈھل جاتے ہیں۔ لیکن جوش کی شاعری کا بلند ترین مقام وہ ہے جہاں اُن کا فن کارانہ وجدان، انجذاب کی کیفیت سے آشنا ہوتا ہے اس مقام پر آ کر تفکر و تعقل کی گتھیاں جیسے خود ہی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔ عقل یا دماغ کا زور ٹوٹتا ہے اور شاعر پر وجود سے ماورا اسرار و حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ گرڈ جیف کا کہنا ہے کہ تخلیق کار کی شخصیت تین افراد سے مرکب ہوتی ہے۔۔۔ دنیادار۔ اداکار اور صوفی۔ اب ذرا اِس رائے کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیجیے تو ماننا پڑتا ہے کہ حیات و کائنات کی عمیق ترحقیقتیں اُس پر انجذاب کی اُن ساعتوں میں عقدہ کشا ہوتی ہیں جب اُس کی روح میں عارف کے دل کی دھڑکن گونجتی ہے۔ جوش کے مطالعے میں، ہم دیکھتے ہیں کہ ان وجدانی لمحوں میں اُن کا سارا تعقل، سارے سوالات اور تمام تر کفر و الحاد سب کچھ تحلیل ہو جاتا ہے۔۔۔ اور تب ہم ایک شاعر کو کہتے ہوئے سنتے ہیں:

کر روح میں بابِ کفر و ایماں مسدود
وہ فہم کی وحشت ہے یہ دانش کا جمود

انکار بہ ایں دماغ کم زور و علیل
اقرار بہ ایں عقلِ ضعیف و محدود

علّت کا نہ معلول وقضا کا منکر
حاشا نہ خبر نہ مبتدا کا منکر
یاروں نے تشخص کا تراشا ہے جو بُت
الحاد ہے صرف اُس خدا کا منکر

شعورِ حق کی اِس منزل پر پہنچنے کے بعد شاعر کے دل میں اعترافِ حقیقت کی جرائت خود بہ خود پیدا ہو جاتی ہے۔اس کی نگاہوں پر اپنے کفر والحاد کا پردہ خود چاک ہو جاتا ہے تب وہ اپنے وجدان کے سائے میں آکر خود سے مخاطب ہوتا ہے اور اپنی عقل سے پوچھتا ہے:

وابستۂ آسماں نہ پابند زمیں
انکار نہ اقرار نہ دنیا ہے نہ دیں
اے عقل غریب، یہ سیاحت کب تک
تیرا بھی کوئی وطن بنے گا کہ نہیں؟

یہ احساس واضطراب شاعر کے دل میں کس خواہش کو بیدار کرتا ہے اور کس طلب کو جگاتا ہے، ذرا یہ بھی ملاحظہ کیجیے:

ہے کوئی، جو اس دُھویں کو گلشن کر دے؟
ٹکڑے اس تیرگی کا دامن کر دے
دل پر ہے گھٹا ٹوپ اندھیرے کا دَباؤ
اللہ، کوئی چراغ رَوشن کر دے!

سو یہ خواہش، یہ طلب اور یہ آرزو رائگاں نہیں جاتی اور اُس پر انکشافِ حقیقت کا در کھل جاتا ہے۔اب اُس کے سامنے ایک دوسری ہی دنیا ہے۔۔۔اور اسے جب یہ سب جاننے کا لمحہ

میسر آتا ہے تو پھر اس کے یہ ماننے میں اب کوئی شے حائل نہیں رہتی کہ:

نہ جا ان کفر کی باتوں پہ میری
یہ حق کے گیت ہیں جو گا رہا ہوں
بہ شکلِ رہزنی ہر قافلے کو
حقیقی راستے بتلا رہا ہوں

جسے یوں کھو رہا ہوں ہر قدم پر
اسی کو ہر نفس پر پا رہا ہوں
اسی کے بُعد پر نازاں ہوں اتنا
اُسی کی قرب پر اترا رہا ہوں

اسی کے نام کو تاریک کر کے
اسی کی ذات کو چمکا رہا ہوں

اور یہ جو ذات کو چمکانے والی بات ہے، یہ محض ایک شاعرانہ بیان نہیں ہے کہ کسی ترنگ میں جوش کی زبان پر آ گئی ہو۔ جوش جانتے ہیں کہ یہ مرحلہ اُسی وقت آتا ہے جب شاعر کے قالب میں عارف کی روح بیدار ہوتی ہے۔ انھیں اس امر کا بہ خوبی شعور ہے کہ ذات کو پہچاننے اور ماننے کی منزل تو صرف عارف ہی کے حصے میں آتی ہے:

عامی نے حجابات سے تعبیر کیا
عالم نے نشانات سے تعبیر کیا
اس ارض و سما کے ذرّے ذرّے کو مگر
عارف نے فقط ذات سے تعبیر کیا

دیکھیے یہ تدّبر کا محل ہے کہ عارف کس منزل کا ہے۔۔۔ وہ جسے ارض و سما کے ذرّے

ذرّے میں ذات کی جھلک نظر آتی ہے۔ شہود کے مقامات سے وجود کی اِس منزل تک کیا کوئی الحادی، کوئی دہریہ پہنچ سکتا ہے؟ نہیں۔ جوش کوئی صوفی نہیں تھے، ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ عقل کی میزان پر زندگی اور اس کی حقیقتوں کو پرکھنا اور وجودی تجربے کی کسوٹی پر ان کا اثبات کرنا جوش کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ لیکن اپنے سارے تفکرات وتعقلات اور تضادات واضطرابات کو انھوں نے تخلیقی وجدان کی ارفع ترین ساعت میں بہرطور resolve کر لیا تھا۔ چنانچہ اس مرحلۂ فکر پر آ کر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خدا کے تصور اور تلاش کی جس راہ پر وہ نکلے تھے، اس میں مسافت تو بلا شبہ انھیں بہت طے کرنا پڑی لیکن یہ ضرور ہے کہ اُن کی منزل کھوٹی نہیں ہوئی۔ خدا، جیسا کہ پہلے کہا گیا، جوش کی شاعری کا سب سے بڑا اور مرکزی مسئلہ ہے۔ حیات کا تصور، کائنات کی ماہیت، انسانی عقل وارادے کی حیثیت، اس کے اعمال اور رشتوں کی نوعیت غرض جوش کی شاعری میں جو کچھ آتا ہے، وہ سب اسی مرکزی مسئلے کے تحت تشکیل پاتا ہے۔

آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے تخلیقی وجدان کی کسی انجذابی کیفیت میں جوش وجودِ باری تعالیٰ کی تشکیک کے اس مسئلے کو بے شک resolve بھی کر لیتے ہیں، لیکن وجدان کی یہ کیفیت شاعر کے لیے ابد نشان نہیں ہوتی کہ ایک بار آ کر اس کے بطون دل میں اس طرح ٹھہر جائے کہ شاعر کی ہمیشہ کے لئے قلب ماہیت کر دے۔ شاعر اور عارف میں یہی فرق تو ہوتا ہے کہ عارف ہمیشہ کے لیے خود کو بدل کر لوٹتا ہے اور شاعر جب لوٹتا ہے تو آ کر پھر بدل جاتا ہے۔ جوش عارف نہیں، ایک شاعر ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کے اندر خدا کے اثبات ونفی کی کشاکش حتمی طور پر ختم نہیں ہوتی۔ یہاں سوالوں کا سلسلہ رہ رہ کر ٹوٹتا اور جڑتا ہے۔ شک یقین سے اور یقین شک سے بار بار ٹکراتا ہے۔

لہٰذا دیکھا جا سکتا ہے کہ جوش کے شعور واحساس کی کیفیت مستقل مدوجزر کی سی رہتی ہے۔ متواتر لہریں اٹھتی رہتی ہیں اور بھنور پڑتے رہتے ہیں۔ یہاں ہمارے لیے اہم سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال نے جوش کے اپنے رویے کا تعین کیسے کیا؟ یعنی شاعر زندگی کی طرف کیسے دیکھتا ہے اور انسانوں کی بابت اس کی سوچ کیا ہے اور وہ ان سے باہمی رشتہ کس طور استوار کرتا

ہے؟ جوش کی شاعری ایک ایسے شخص کی شاعری ہے جس کے یہاں باقی تمام تجربات پر وجودی تجربے کو تقدم حاصل ہے، لیکن اِس نکتے پر مزید گفتگو سے قبل ہمیں ایک بات کو سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ کہ جوش کے یہاں وجودی تجربے کے وہ معنی ہرگز نہیں ہیں جو ہمارے ادب و شعر میں Existentialism کے زیر اثر آئے ہیں۔ یہاں تو وجودی تجربے کے معنی ہیں گوشت پوست کے آدمی کا پانچوں حواس کی بیداری کے ساتھ زندگی کا جسمانی تجربہ۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جوش کا تصورِ انسان، حواسوں کی بیداری اور جسمانی تجربات پر انحصار کے باوجود اُس عام آدمی کی حقیقت سے ماخوذ اور اس کے ادراک سے مرتب نہیں ہوا جو روزمرہ زندگی میں جوش کے تجربے میں آتا ہے بلکہ جوش کا یہ انسان آئیڈیل انسان ہے جو اعلیٰ ترین صفات کا حامل اور قوت و حیات سے معمور ہے اس کی نگاہ بلند، دل کشادہ، ظرف وسیع اور آدرش بڑے ہیں۔ یہ شاہِ گیتی ہے، صاحبِ آفاق ہے، آسمان کا داور ہے، امیرِ بوستاں ہے۔ وارثِ اسرارِ فطرت ہے۔ یہی نہیں اور بہت کچھ ہے، کیا کیا کچھ ہے ذرا خود جوش صاحب سے سنیے:

طفلِ باراں، تاج دارِ خاک، امیرِ بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ
ناز پرور، لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

شاہِ گیتی صاحبِ آفاق، دارائے حیات
ابرِ رحمت وارث فطرت، رئیسِ کائنات

اوج کا نباض، پستی کا طبیب و چارہ ساز
برق پیما، ابلقِ شام و سحر کا شہ سوار

جوش صاحب تو اپنے اس انسان کے اوصاف و مقامات کے بیان سے ابھی نہیں رُکیں

گے مگر بات طول کھینچتی جائے گی، چلیے ہم ہی اس نکتے پر ٹھہر جاتے ہیں۔ یوں بھی مقصد صرف جوش کے انسان سے تعارف حاصل کرنا ہے جو اِن خطابات، القابات اور توصیفات سے بہر حال پورا ہو جاتا ہے۔ اس تعارف کے بعد ہمیں یہ جاننے میں قطعاً دقت نہیں ہوتی کہ جوش کا یہ تصورِ انسان ہمارے ارد گرد گھومتے پھرتے اور ہمارے تجربے میں آنے والے اصل انسان کو سامنے نہیں لاتا۔ اس کے برعکس یہ تخیلی انسان ہے اور وہ بھی مشرقی تہذیب وادب کا پروردہ نہیں بلکہ نشاۃِ ثانیہ کے بعد والے مغرب کا۔ یہ وہی انسانی ہیولا ہے جو مغرب نے خدا کو معزول کرنے کے بعد اس کی سلطنت واقتدار سونپنے کے لیے تیار کیا تھا۔ جوش کی ملاقات اس انسان سے مغربی افکار ونظریات کی سیر و سیاحت کے دوران ہوئی ہوگی۔ جوش اس کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اسے اپنے یہاں، لے آتے ہیں۔ بس یہیں سے اس مشکل کا آغاز ہوتا ہے جسے نتیجے کے طور پر یار لوگ جوش کی فکر کا تضاد قرار دیتے ہیں۔۔۔ اور جو لوگ جوش صاحب کے لیے ذرا ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں وہ اس مسئلے کو ان کی فکر کے کلاسیکی اور رومانی پہلوؤں سے تعبیر کر کے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے مسائل بھلا یوں کہیں سنبھلا کرتے ہیں۔

ماجرا اصل میں یہ ہے کہ جوش کا تصوّرِ انسان تو مغرب کا ہے لیکن خود جوش کا اپنا مزاج مغربی نہیں ہے۔ چنانچہ کے یہاں اس آدمی کی صورت بدلنے لگتی ہے، جب وہ اسے جذبات کا پیکر بناتے ہیں۔ بس گڑبڑ یہیں ہوتی ہے۔ تفکر وتعقل کی بیٹری سے چلنے والے انسان کو جوش جذبات کی چابی سے چلانا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ گڑبڑ ہوئی آخر کیوں؟ حالانکہ جوش صاحب نے انسان کے جو اوصاف دیکھے اور گنوائے تھے اُن کے بیان میں انھوں نے نطشے اعظم اور ہٹلر اعظم سے لے کر اپنے دہقان ومحنت کش تک میں کوئی فرق نہیں کیا تھا۔ سب کے سب ایک ہی مقام ومرتبے کے تھے۔ اصل میں انسان کا یہ تصور جوش کے یہاں چل نہیں سکتا تھا، اور جوش ہی پر کیا موقوف، خود مغرب میں کون سا چل گیا۔ بہر حال جوش کے یہاں نہ چلنے کا سبب یہ ہے کہ اُن کے ذہن کی مشرقی ساخت انھیں صرف اس تصور تک محدود نہیں رہنے دیتی، وہ اس اعلیٰ اوصاف کے انسان کی سطح سے اُتر کر اصل انسان تک پہنچے اور اس کے مسائل وحقائق سے آگاہ ہوئے بغیر نہیں

رہ پاتے۔ انسان پرستی کے بلند مقام سے اُتر کر وہ اپنے تجربے میں آنے والے حقیقی آدمی کو فراموش کر ہی نہیں سکتے۔ مزید خرابی یوں بھی ہوتی ہے کہ یہ اصل گوشت پوست کا آدمی اپنی کمزوریوں، خامیوں، کوتاہیوں، مجبوریوں اور لاچاریوں کے ساتھ ان پر عیاں ہوتا ہے۔ یہاں مشرقی تہذیب کی تربیت جوش کے کام آتی ہے اور وہ اس آدمی کو جھٹلاتے نہیں۔ اس کی نفی نہیں کرتے بلکہ اسے قبول کرتے ہیں، اس کی اصلیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ تو اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس عام، کمزور اور پست آدمی کو بلند مرتبے پر فائز کرنا تو خیر اُن کے بس میں نہیں لیکن اس کا بطلان بھی انھیں منظور نہیں ہے۔ لہٰذا جب وہ اسے مان لیتے ہیں تو اُس کی زندگی کے حقائق کو بھی مان لیتے ہیں۔ اُس کی مجبوریوں اور تقدیر کے آگے اس کی بے چارگی کو بھی مان لیتے ہیں، تب وہ کہتے ہیں:

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیّت کا
کہ قلبِ آدمِ خاکی سدا فگار رہے

------ (بے مہر مشیت)

خوشیاں منانے پر بھی ہے مجبور آدمی
آنسو بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی

اور مسکرانے پر بھی ہے مجبور آدمی
دنیا میں آنے پر بھی ہے مجبور آدمی
دنیا سے جانے پر بھی ہے مجبور آدمی
مجبور و دل شکستہ و رنجور آدمی

(اے وائے آدمی)

اب یہاں ایک بات غور طلب ہے کہ جوش کا اصل آدمی جس کی حقیقت سے وہ آگاہ ہیں، وہ ان کی تشکیک یا انکار کی دین نہیں ہے۔ یہ تو وہ آدمی ہے جس کی نسبت سے وہ تقدیر کو تسلیم کرتے ہیں اور انسانی زندگی میں مشیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ یعنی بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ طور پر

ہی سہی، جوش کی تشکیک کا مسئلہ اس آدمی کے حوالے سے اس طرح طے ہوتا نظر آتا ہے کہ وہ اقرار کر لیتے ہیں اس قوت کا یا ایسی طاقت کا جسے انسان اور اس کی زندگی پر مکمل اختیار حاصل ہے لیکن یہاں اہم بات یہ ہے کہ اعتراف کے اس مرحلے پر آ کر بھی جوش کے یہاں اقرار اور ایمان کا آوازہ بلند نہیں ہوتا۔ وہ سپر انداز نہیں ہوتے۔ اثبات کی منزل کی طرف قدم نہیں بڑھاتے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ آدمی ان کے یہاں صرف ایک وجودی حقیقت کے درجے میں اپنی شناخت پاتا ہے۔ جوش اس کے حواس اور ان کے کام سے واقف ہیں، اس کی وجودی ضرورتوں اور جسمانی مطالبات سے آگاہ ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان سب عوامل کے تحت اس کا مزاج کیا ہو سکتا ہے اور وہ کس فطرت کا مالک ہوگا، اس کی بھی انھیں خبر ہے۔ اس لیے اس اعتراف میں انھیں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ:

آدمی بد عہد ہے، بدخو ہے، بے آئین ہے

وہ یہ بات صاف لفظوں میں تسلیم کرتے ہیں کہ:

آدمی ہوتا ہے ظالم، بے مروّت، زِشت خو
بے وفا، بے مہر، خودسر، بے حیا، بے آبرو

المیہ یہ ہے کہ اپنے آدمی سے اس درجہ باخبری کے باوجود انھیں اس کی قلبِ ماہیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے دل کا گداز، فطرت کی لطافت اور روح کے اسرار جاننے کی جستجو اُن کے یہاں ناپید ہے۔ اس کی کوئی ضرورت یا خواہش ان کے یہاں ہمیں نہیں ملتی کہ وہ اس آدمی کو وجود کی سطح سے بلند ہوتا ہوا دیکھیں۔

جرمنی کے ممتاز یہودی شاعر ہنرخ ہائنے کے بارے میں ولیم شارپ نے لکھا ہے کہ وہ فلسفیانہ ذہن رکھتا تھا لیکن اس کی فکر کسی نظریے کی صورت مربوط نہ تھی، وہ جذبات پرستی کو ہیچ گردانتا تھا لیکن خود اس کے اندر ایک جذباتی انسان موجود تھا۔ تو جوش کا مسئلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ان کا تصورِ انسان بھی دو قطبین کی صورت اور دو انتہاؤں پر ہمیں ملتا ہے۔ ایک وہ صورت ہے کہ جب وہ قوت پرستی اور انسان پرستی کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں، زندگی کا انتساب بنام قوت

وحیات کرتے ہیں اور اپنے آئیڈیل انسان کے لئے لاالہٰ الا انسان کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ دوسری صورت ہے کہ جہاں یہ آدمی بدفطرت ارذل، اسفل، زشت خو اور بے آئین ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اب یہاں ایک لمحے کے لیے یہ سوال ضرور ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ جوش اگر ان دو انتہاؤں پر قائم شدہ دونوں تصوّرات کو ملانے کی کوشش کرتے تو کیا وہ ایک تہذیبی آدمی کو پانے میں کامیاب ہو جاتے؟ لیکن یہ بحث تو اسی وقت مفید ہوتی جب وہ اس آدمی کو اس کی روح کے ساتھ دریافت کرتے اور اس کی روحانی حقیقت کا اعتراف کرتے۔ اب ماجرا یہ ہے کہ اس میں ایک بڑی مشکل تھی۔۔۔ وہ یہ کہ اس کام کے لیے انھیں خود بھی ایک بے خدا کائنات سے با خدا کائنات میں آنا اور پھر یہیں رہنا پڑتا۔

رہا سوال یہ کہ جوش کا تصورِ زندگی کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں اُن کے اس آدمی کی زندگی، انسانوں سے اس کے رشتے اور خصوصاً اس کی معاملہ بندی یا حسن سے ربط وضبط میں ملتا ہے۔ یہ بات کسی اچنبھے کا باعث نہیں ہونی چاہیے، اگر جوش کے یہاں ہمیں تصور انسان کی دو صورتوں کی طرح عشق کا تصور بھی دو انتہاؤں پر قائم ہوتا ہوا نظر آئے۔ تو اب یہ ہے کہ جوش کے یہاں احساس اور شعور کی دوئی حسن وعشق کے قصے میں بھی اسی طرح کارفرما نظر آتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف جوش کے یہاں عشق کا افلاطونی تصور پایا جاتا ہے جو جنس کو اور جسمانی لذت کے حصول کو عشق کی موت سمجھتا ہے اور ایک دائمی ہجر، مسلسل کسک اور نہ ختم ہونے والی تڑپ جس کی معراج ہے۔

گدازِ دل سے باطن کا تجلّی زار ہو جانا
محبت اصل میں ہے روح کا بیدار ہو جانا

اس تصور عشق میں جسم کی ضرورتوں اور جنس کی کشش کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عشق نے عاشق کو تطہیر کے عمل سے گزار کر اب اس جگہ پہنچا دیا ہے جہاں ایسے سوالات اٹھتے ہی نہیں اور وہ اطمینان سے کہتا ہے:

قلب آلودہ نہیں جسمانیت کے زنگ سے

روح بالا ہو چکی ہے سطحِ آب و رنگ سے

ظاہر ہے کہ یہاں کسی فطری انسانی تقاضے کا کوئی شائبہ نہیں ہے لیکن بالفرض محال اگر کبھی محض یہ خیال بھی گزرے کہ جسم ایک حقیقت ہے اور یہ پکارتا بھی ہے تو کیا ہوتا ہے؟

عیش کی جانب جو مائل کچھ طبیعت ہو گئی
دل پہ غصہ آ گیا اپنے سے نفرت ہو گئی

یہ اُسی آئیڈیل آدمی کے خیالات ہو سکتے ہیں جسے جوش نے اپنے تخیل اور مغربی افکار کی مدد سے تراشا تھا۔ یہ آدمی سراپا خیر تھا، سو اُس سے جنسی عمل جیسے کسی شر کی توقع کیسے رکھی جائے۔ ہاں وہ جو اُن کا ارذل اور اسفل آدمی ہے وہ ہمیں دوسری انتہا پر اپنے تصورِ عشق کا اظہار کرتا ہوا ملتا ہے اُس کی حقیقت پسندی کس سطح کی ہے ذرا یہ بھی ملاحظہ کیجیے

یہ ہیں فقط شاعری کی باتیں
یہ ہیں فقط صوفیوں کی زٹیں
کہ عشق ہے روح بے کرانی
کہ عشق ہے جنس آسمانی
مگر یہ اب پول کھل چکا ہے
کہ عشق ہیجان جسم کا ہے
نہ عشق اعلیٰ نہ عشق احسن
فقط اک اعصاب کی ہے اینٹھن

جوش صاحب پہلے اور آخری شاعر نہیں ہیں جن پر عشق کا دھوکا کھلا ہو۔ ان سے پہلے اور بعد میں بھی کئی ایک نے جسم کی پکار کو عشق کی سچائی بتایا ہے۔ لیکن جوش کے یہاں فرق یہ ہے کہ جب یہ دھوکا کھلتا ہے تو عاشق کے لئے رُکنے رُکوانے کی کوئی حد باقی ہی نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ مزدور عورت کو مشقت کی سخت سے سخت آزمائش سے گزرتے ہوئے دیکھ کر بھی اس کی آنکھیں اس عورت کے بدن کو ٹٹولنے میں محو ہو جاتی ہیں۔ سنگِ اسود سے تراشے ہوئے بدن دیکھ کر اُس کا دل

چٹکیاں لینے کو مچلتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ عورت جوش کے یہاں فرشتوں کے سے منزّہ عشق والی عفت مآب محبوبہ کی حیثیت سے ملتی ہے یا پھر محض جسم کے طور پر کہ جسے دیکھ کر صبر کرنا محال ہو جاتا ہے۔ گدگدانے، چھیڑنے، ٹٹولنے کی خواہش زور کرنے لگتی ہے اور ذہن اس سے آگے کی منزل کی جانب چل نکلتا ہے۔ اصل میں یہ وہی وجودی حقیقت کا مسئلہ ہے جو ہر شے کو ایک ہی زاویے سے دیکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس مقام پر ہم جوش کے آدمی کی محض وجودی تجربے کے طور پر شناخت کرتے ہیں اور ہمیں اس کے اندر روح کی ہولناک کمی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ وہ کمی ہے جسے خیالات کا ریلا، فلسفوں کی چکاچوند، نظریات کی بڑی بڑی چٹانیں اور الفاظ کے طلسمی پردے غرض کوئی شے پورا نہیں کر سکتی۔ آدمی سرتاپا جذبات کا میدانِ حشر بنا رہتا ہے۔ نفس کے پل صراط پر چلتے ہوئے بار بار کٹ کر گرتا ہے لیکن صبر و ثبات کا لمحہ نہیں آتا اور اُسے کسی طرح روح سے محرومی کے اندوہناک عذاب سے نجات نہیں ملتی۔

تو پھر ہم سوچتے ہیں کہ آخر اس آدمی کی منزل کیا ہے، اس کی تقدیر کیا ہے؟ تب اس آدمی کا وجودی تجربہ اس کی Ultimate reality کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس سے قبل ہم نے جوش کے سوالوں کی گونج میں اضطراب والم کی جس کیفیت کو محسوس کیا تھا، اُس کی نوعیت، بیش از بیش ایک ذہنی تجربے کی تھی۔ وہ اپنی نہاد میں عقلیت پسندی کا زائیدہ تھا۔ افکار و نظریات اسے کمک پہنچاتے تھے۔ دماغ کی کدو کاوش اسے مستحکم کرتی تھی۔۔۔ لیکن اس منزل پر آ کر یہ آدمی کچھ ایسی ہی کیفیت میں ملتا ہے کہ:

الآخرالامر آہ کیا ہوگا!

جوش نے اس تجربے کو "غروب جمال" کے عنوان سے سمیٹا ہے۔ ہماری شاعری کی روایت اس سے قبل بھی اس سوال اور تجربے کی اس کیفیت سے خالی تو بے شک نہیں ہے لیکن چاہے ایک ہی زاویے سے سہی، جوش نے احساس کے جس وسیع سیاق وسباق میں اس تجربے کو گرفت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کچھ انھیں کا حصہ نظر آتا ہے۔ ذرا اس کے رنگ دیکھیے:

کیسی محفل ہوئی ہے برہم، اے جاں

کیا وقت کی لَو ہوئی ہے مدہم، اے جاں
اب، قُرب میں ہے بُعد کا سناٹا سا
کل بعد میں تھا قرب کا عالم، اے جاں

وہ جذبۂ اختلاطِ پیہم نہ رہا
وہ رنگ، وہ رَس، وہ پیچ وہ خم نہ رہا
اب بھی وہی تم ہو، اور وہی ہم لیکن
چہروں کے بدلتے ہی وہ عالم نہ رہا

بے مائیگیٔ نیاز و افلاسِ گداز
ناداریٔ عشوہ و تہی دستیٔ ناز
کوتاہ نگاہوں کو بتاؤں کیوں کر
کیا حادثۂ عظیم ہے عمرِ دراز

یادو، صفِ ترکاں میں نہ لے جاؤ مجھے
صحنِ دلِ ویراں میں نہ لے جاؤ مجھے
قبریں ہیں جہاں دورِ طرب کی تا دُور
اُس گورِ غریباں میں نہ لے جاؤ مجھے

ہمارے لیے سب سے اہم اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس منزل پر آ کر جوش کے آئیڈیل آدمی اور حقیقی آدمی کے تجربات واحساسات کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ اس مقام پر آ کر دونوں کا فرق وامتیاز مٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہ درحقیقت انسانی تجربے کی سچائی اور آفاقیت ہے۔ غروبِ جمال صرف حسن کے ماند پڑنے اور عشق کے تند وتیز بہاؤ کے ٹوٹنے سے عبارت نہیں ہے۔ یہ تو اصل

میں قوتِ حیات کے اضمحلال کا اعلامیہ ہے۔ جوش کی سوال پسند طبیعت یہاں بھی سوال تو اٹھاتی ہے، احتجاج تو کرتی ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگلی منزل سکوت کی ہے۔ اس سے آگے انسان کی بے اختیاری کی سرحد شروع ہوتی ہے اور سوال وکلام کا سلسلہ تھم جاتا ہے۔ یہ اُس کی تقدیر کے ظہور کا وہ لمحہ ہے جس سے مفر ممکن نہیں اور نہ ہی جس کا بطلان ہو سکتا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس مقام پر آکر جوش کو اب نہ تو اپنے آئیڈیل کا زور، صلابت اور لطافت اس کی تقدیر کے احوال سے الگ شناخت کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی اُن کے عام اور پست درجے کے آدمی کی کمزوری، بے مائیگی اور کثافت ہمیں علیحدہ سے کچھ بھانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ ارتباط کا مقام ہے۔ یہاں مرج البحرین کا عمل ہو رہا ہے جو معرفت کی ایک الگ ہی منزل کا نشان بنتا ہے۔

جوش کی شاعرانہ قدر و منزلت کے عوامل پر غور کیا جائے تو یہ بات بھی امتیازی نشان کے طور پر سامنے آتی ہے کہ جوش کی شاعرانہ آواز اُن کے بطونِ ذات سے ابھرتی ہے اور یہ آواز شاعر کے تجربہ واحساس کی سچائی پر گواہ ٹھہرتی ہے۔ جوش نے اپنے کسی تجربے کے بیان میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی، اپنے احساس کے کسی رنگ کو چھپانا ضروری نہیں سمجھا۔ جن سوالوں سے ان کا ذہن الجھتا تھا اپنے تجربے میں انھوں نے جرأت اور دیانت کے ساتھ اُن سے آنکھیں چار کی ہیں۔ جذبے کی رَوانھیں جس کھونٹ کی مسافت پر لے نکلی وہ نہ صرف اس پر روانہ ہوئے بلکہ اس مسافت کے احوال کو بھی انھوں نے بے ریائی سے بیان کرنے میں کسی طرح کی جھجک کو اپنا مسئلہ نہیں بنایا۔ ان کی انا نے انھیں جن مراتب کی سیر کرائی اس کو منظرِ عام پر لانے میں انھوں نے کوئی تامل نہیں کیا۔ اسی طرح زیاں اور زوال کے احساس کو بھی اس کی گہری تلخی کے ساتھ زبان تک لانے سے وہ ہرگز نہیں چوکے۔ گویا زندگی اور اُس کے تجربات کا ایسا کوئی رنگ نہیں ہے جو اُن کے تجربے اور مشاہدے میں نہ آیا ہو اور اُسے فن بنانے سے وہ گریزاں رہے ہوں۔ چنانچہ جب وہ یہ کہتے ہیں تو کسی مبالغے کا گمان نہیں ہوتا بلکہ سچ ہی لگتا ہے:

موجِ تسنیم قلبِ سوزاں پہ نثار
ابرِ فردوس، فکر جولاں پہ نثار

صد جامۂ کیقباد و صد خلعتِ جم
فن کار کے ایک چاکِ داماں پہ نثار

جوش کی شاعری ایک وجودی آدمی کے تجربے کو بہ تمام وکمال گرفت میں لینے کی ایک بے حد سفاک لیکن خالصتاً فنکارانہ کاوش کا حاصل ہے۔ والٹ وہٹمین کے بارے میں اوکٹیویو پاز نے لکھا ہے کہ وہ ایک ایسا جدید شاعر ہے جسے اپنے عہد کی دنیا کا سامنا کرتے ہوئے کسی نزع یا خفت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ اس کے فن میں شاعرانہ خواب اور تاریخی حقائق باہم آمیز ہو جاتے ہیں۔ جوش کے یہاں بھی اُن کے شاعرانہ خواب، آدرش اور تمنائیں، انسانی تقدیر کے حقائق، اس کی سچائیوں اور المیوں کے ساتھ ساتھ ملتے ہیں۔ یہی وہ شے ہے جو آج جوش کے نئے مطالعے کی راہ ہموار کر رہی ہے۔ چنانچہ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے کے اختتام تک آتے آتے اگر ہماری زبان اور اُس کے ادب میں از خود جوش کی شاعری کے مطالعے کی ضرورت کا احساس اجاگر ہو رہا ہے تو یقیناً یہ جوش کے ہمارے عہد سے مربوط ہونے کا ثبوت فراہم کرسکتا ہے اور یہی ان کی شاعری کے زندہ ہونے کا جواز بھی۔

☆☆☆

حسن یوں کھویا ہوا ہے بزمِ محسوسات میں
جیسے دونوں وقت ملتے ہوں بھری برسات میں

جوشؔ

جوش اپنی رباعیات کے آئینے میں

اقبال مرزا (لندن)

کسی شاعر کی شاعری سمجھنے کے لئے شاعر کو جاننا اور اس کے پسِ منظر سے واقفیت کا ہونا از حد ضروری ہے۔ شاعر بس شاعر ہوتا ہے وہ جب گفتگو کرتا ہے تب اس کا ماحول اس کی گفتگو میں عیاں ہوتا ہے، ہم اس کی شاعری سے اس کے حالاتِ زندگی اس کی پرورش سے کافی حد تک واقفیت حاصل کر لیتے ہیں جیسے میر کا شعر مُلاحظہ فرمائیں:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میرؔ کا یہ شعر میرؔ کی بے بسی میر کی زندگی کسمپرسی میرؔ کی تنگ دستی میرؔ کی ناکامیاں غرض بہت کچھ کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اس کے برعکس سودا کا ایسی نوعیت کا شعر بھی ملاحظہ فرمائیں:

سودا کی جو بالی پہ ہوا شور قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

بات تو دونوں حضرات نے ایک ہی کہی مگر دونوں کے آہنگ میں زمین آسمان کا فرق نمایاں ہے سوداؔ کو زندگی میں وہ سب کچھ ملا جو میر تقی میر کو زندگی میں نصیب نہ ہو سکا چنانچہ دونوں کی گفتگو میں نمایاں فرق کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح جوش کا بچپن جس آرام و آسائش میں بسر

ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اسی لئے جوش کے کلام میں ایک طرح کی تمکنت خوداعتمادی اور گھن گرج پائی جاتی ہے۔

مشفق خواجہ مرحوم نے جوش صاحب کا کیا خوب تجزیہ کیا ہے:

''جوش صاحب کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے حسن نے بھی ایک عالم کو مسحور کر رکھا ہے، انہوں نے اپنے کردار کی کرشمہ سازیوں کی وجہ سے پُرکشش افسانوی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان کے گرد پسند و ناپسند کا وسیع حلقہ قائم ہے، بہت سے لوگ ان کے محاسن کی وجہ سے ان کی مدح سرائی کرتے ہیں بعض دوسرے انہیں محاسن کو معائب گردانتے ہوئے ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اردو ادب کی تاریخ کا یہ ایک نادر واقعہ ہے کہ جوش کی زندگی ہی میں ان کے خلاف ایک ادبی رسالے کا ضخیم جوش نمبر شائع ہوا جس میں درجنوں معاصرین نے جوش کے ان ''عیبوں'' کی نشاندہی کی جو اگر جوش میں نہ ہوتے تو ہم ایک طرح دار اور رنگا رنگ شخصیت سے محروم رہ جاتے۔ جوش کی شخصیت کے عیوب و محاسن پر ابتک جو گفتگوئیں ہو چکی ہیں ان کے پیش نظر یگانہ کے اس شعر پر گمان ہوتا ہے جیسے یگانہ نے جوش ہی کو سامنے رکھ کر یہ کہا ہو:

نکالے عیب میں سو حسن، حسن میں سو عیب
خیال ہی تو ہے جیسے بندھے جدھر بھی بندھے

جوش صاحب کو اپنے خلاف فضا پیدا کرنے میں خود مزا آتا تھا۔ اُسے ان کی سادگی کہیئے یا کردار کی مضبوطی کہ غلط یا درست جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہ زبان پر آجاتی تھی۔ وہ اس سلسلے میں نفع و نقصان کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا خالص نفع تو ان کی شاعری تھی باقی جو

کچھ بھی تھا وہ خسارہ ہی خسارہ تھا''

جوش منافق نہیں تھے اور یہ بات جوش کے مخالفین کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ جوش نے ہر بات کھل کر کہی وہ چاہے جوش کے خود ہی خلاف جاتی ہو پھر دوسری بات کہ جوش کو علمی میدان میں شکست دینا ان کے مخالفین کے بس میں نہیں تھا چنانچہ جب جوش کی پوزیشن کو کم سے کم کرنے کوئی صورت نظر نہ آئی تو عوام میں یہ بات پھیلائی گئی کہ جوش ایک ملحد اور دشمن اسلام ہیں۔ حضرات آپ سب جانتے ہیں کہ ہم جس معاشرے میں پلے بڑھے ہیں ہم صرف سنی سنائی بات کو امنا صدقنا مانتے ہوئے بلا تحقیق اس پر گامزن ہو جاتے ہیں اور یہی جوش کے ساتھ بھی ہوا اور ایک بہت بڑا گروپ صرف اس لئے مخالف ہو گیا کہ جوش ملحد ہے جوش فطرتاً تحقیقی ذہن کے مالک تھے وہ بلا تحقیق کوئی بات ماننے کے روادار نہیں تھے اس کی مثال میں انہی کے ایک جملے سے یوں دو نگا وہ فرماتے ہیں ''اعتقاد اور آتش بازی میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے مگر جس طرح آتش بازی سورج کی روشنی میں پھیکی پڑ جاتی ہے اسی طرح اعتقاد عقل کی کسوٹی پر زیادہ تر دم توڑ دیتا ہے'' اس فکر کے آدمی سے اگر آپ یہ توقع کریں کہ وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی رسموں کو اپنے آزاد ذہن کی روشنی میں جوں کا توں مان لے گا تو میرے خیال میں یہ ناممکن ہے۔ جوشؔ بھی غالبؔ یا میر کی طرح وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے جوش نے جس انداز سے لوگوں سے باتیں کیں وہ شاید لوگ سمجھ ہی نہ سکے جیسے جوش کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں:

ہر روز بپا جشن کریں گے اے جوشؔ
پیمانہ سر خوشی بھریں گے اے جوشؔ
کیا موت کی ہستی ہے کہ دامن چھو لے
اللہ مرا تو ہم مریں گے اے جوش

سطحی فکر رکھنے والے شخص کو اگر آپ یہ رباعی سنائیں تو وہ یہی کہے گا ہے ہے جوش نے کفر اختیار کر لیا اور اللہ کو مارنے کی باتیں شروع کر دیں۔ مگر یہی رباعی جب ان بالغ النظر حضرات سے پوچھیں تو وہ اس کا مطلب قرآن سے دریافت کریں گے قرآن میں سورۃ بقر میں موجود ہے کہ ''اے رسول

جب امت والے تم سے پوچھیں کہ روح کیا چیز ہے تو کہہ دو کے یہ حکم ربی ہے'' اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کہ جسم مردہ ہو جائے گا مگر روح ہمیشہ زندہ رہیگی جوش اسی بات کو کہہ رہے ہیں کہ جب تک اللہ موجود ہے میری روح بھی زندہ ہے اور چونکہ اللہ کبھی نہیں مرے گا اس لئے میں بھی ہمیشہ ہمیشہ اسی کی طرح زندہ رہوں گا۔

جوش کو نثر اور نظم دونوں پر قدرت حاصل تھی جوش کے متعلق پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کے یہ الفاظ

> ''جوش اقبال کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جانے لگے شروع میں ان کو شاعرِ فطرت کہا جاتا تھا پھر شاعر شباب اور اب شاعر انقلاب سے نوازا گیا جوش کے الفاظ میں آگ کی گرمی اور خیالات میں جوالامکھی کا زور ملتا ہے۔ جوش کو استعمال الفاظ پر غیر معمولی قدرت ہے اردو میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو تشبیہات وصنائع کے نفیس استعمال میں ان کی برابری کر سکے''

جس طرح ہم بچپنے سے جوانی میں اور جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہوتے ہیں اسی طرح ہماری عقل بھی مدارج طے کرتی ہے چنانچہ جوش کی شاعری کو بھی اگر ہم مدارج میں تقسیم کریں تو جوش کے آخری وقت میں ان کے علم کا نچوڑ رُباعیات میں جھلکتا ہے جس میں مفکرانہ خیالات کی جھلک اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ جوش کو منظر کشی میں ید طول حاصل تھا وہ جب منظر کشی کرتے تھے تو الفاظ سے ایسی تصویر بناتے تھے کہ آنکھوں کے سامنے وہ منظر ناچنے لگتا تھا مثال کے لئے آپ بھی یہ رباعی سنیں:

جھنکی جو ہوا جاگ اٹھے ہنگامے
بجتے لمہات نے کلیجے تھامے
چھیڑی گئی راگنی سر بزم طرب
بھیجے گئے ہچکیوں کے دعوت نامے

شاید اس سے پیشتر کسی شاعر نے ہچکیوں کے دعوت نامے اس طرح رقم نہیں کئے تھے یہ جوش کا ہی کارنامہ ہوسکتا ہے۔ بقول سید احتشام حسین جوش کو خود بھی اس بات کا علم تھا کہ وہ الفاظ کو جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں ان کی یہ رباعی اس بات کی غماز ہے:

تلوار کو لچکاؤں تو مرہم ٹپکے
مر مر کو فشار دوں تو زمزم ٹپکے
بخشا ہے تخیل نے وہ اعجاز مجھے
شعلے کو نچوڑ دوں تو شبنم ٹپکے

جوش کی مندرجہ ذیل ایک رباعی سننے کے بعد آپ فیصلہ کریں کہ جوش کس خدا کو مانتے تھے:

باقی سے ہے اک ربطہ یہاں فانی کا
ہے دارو مدار اس پہ حق دانی کا
جیسا بندہ خدا بھی اس کا ویسا
جو رنگ ہے شیشے کا وہی پانی کا

جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جوش کا ذہن تحقیقی ذہن تھا اور جوش کا مشاہدہ بے پناہ گہرا اور عمیق تھا چنانچہ جوش اس گرداب میں پھنسے ہوئے اپنے اردگرد کے ماحول کو یوں بیان کرتے ہیں:

میں کون ہوں میں کیا ہوں کہاں جان سکا
اور غیر بھی اپنے کو نہ گردان سکا
چہرے پہ ہے اس قدر مہ وسال کی گرد
اپنے ہی خدو خال نہ پہچان سکا

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوں میں
پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زبان سے میں نکلتا ہے ندیم

اس پردے میں کائنات کہتا ہوں میں

بنتے ہیں تمام گھر بگڑنے کے لئے
بستے ہیں تمام شہر اجڑنے کے لئے
کیا جبر مشیت ہے کہ راغب ہم بھی
احباب سے ملتے ہیں بچھڑنے کے لئے

ذرات پہ ہے لال و گہر کا دھوکا
ہر جلوہ ہے اک رقص شرر کا دھوکا
جب سطح مشاہدے کی بدلی تو کھلا
آفاق تمام ہے نظر کا دھوکا

چلتا نہیں کچھ زور تماشائی کا
حافظ ہے بس اللہ ہی بینائی کا
ہر برف کی سل میں برق پر افشاں
ہر ماد مرکب ہے توانائی کا

جوش جب پاکستان آئے تو یہاں زر پرستی کا دور دورہ تھا چند عقائد کا نام دین رہ گیا تھا روحِ دین تقریباً ختم تھی مفکر دانشور عالم دردر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو لوٹا جا رہا تھا ان حالات سے متاثر ہو کر جوش نے یہ رباعی کہی:

رنگین تمناؤں کی ہولی دیکھی
~~ساعت~~ کی مسکتی ہوئی چولی دیکھی
کھولا جو در ضمیر خاصان خدا

چھم چھم کرتی ہوئی بتوں کی ٹولی دیکھی

جوش انسانیت پرست تھے وہ انسان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور انسان سے محبت یعنی خود سے محبت کرنے کے مترادف ہے جوش نے اپنی زندگی میں جو درس انسانیت ہم کو دیا ہے وہ پیشِ خدمت ہے:

انسان کو قوموں میں نہ بانٹوں یارو
تفریق کا لا للہ نہ کاجل پارو
جس پر ہے رواں کشتیِ توحید، بشر
اس خون کے دھارے پہ نہ لاٹھی مارو

اقوام کے لفظ میں کوئی جان نہیں
اک نوع میں ہو دوئی یہ امکان نہیں
جو مشرک یزداں ہے ہو ناداں ہے فقط
جو مشرک انساں ہے ہو انسان نہیں

☆☆☆

رُباعیات جوش کا اسلوب و آہنگ

ضیاء الحسن

جوش ملیح آبادی ایک خوش قسمت شاعر تھے کیوں کہ انہوں نے بطور ایک بھرپور زندگی گذاری۔ شاعری کے قاری نے ان کے ناز اٹھائے جوش صاحب ایک بدقسمت شاعر تھے کیوں کہ ان سے محبت کرنے والوں اور ان کو بہ طور شخص و شاعر ناپسند کرنے والوں......دونوں نے ان کے مقام کو نہیں پہچانا۔ ناپسند کرنے والوں سے تو کیا شکوہ کہ ان کا طرز عمل قابل ضہم ہے۔ لیکن محبت کرنے والوں کا عمل بھی ان کے مقام و مرتبے کے تعین کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ایسی تمام تخلیقی شخصیات جن کے چاہنے والوں نے ان کے مقام کے تعین میں غلو کیا انہوں نے ناسمجھی میں ان شخصیات کو ان کے جائز مقام سے محروم کرنے میں کردار ادا کیا۔ موجودہ دور میں ایسے شاعروں میں جوش صاحب کے علاوہ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جوش صاحب کو اقبال اور فیض و ندیم کو غالب کے مرتبے پر فائز کرنے والے نقادوں نے فی الاصل ان شاعروں کو ان کے مقام سے محروم کرنے کی سعی کی ہے۔ کوئی شاعر نہ اپنے تخلیقی سبھاؤ میں کسی دوسرے شاعر جیسا ہوتا ہے اور نہ ہی مقام و مرتبے میں۔

جب کسی ایک تخلیق کار کا کسی دوسرے تخلیق کار سے موازنہ کیا جاتا ہے تو اس کا مقصود بعض فکری یا فنی مشابہتوں کے ذریعے شاعری کی تفہیم ہوتا ہے کسی ایک شاعر کے کام سے کسی دوسرے شاعر کو چھوٹا بڑا قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ہر شاعر کے مقام و مرتبے کا تعین صرف اس کے

اپنے تخلیق سے ہی ممکن ہے۔ جوش شناسی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ اپنے کام سے سمجھنے کے بجائے انہیں دوسرے شاعروں خصوصاً اقبال سے بھڑانے کی کوشش زیادہ کی گئی۔ اس رویے سے مایوس نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ کوئی غیر تخلیقی رویہ کسی شاعر کو زیادہ دیر تک اس کے مقام سے محروم نہیں رکھ سکتا۔ یہ مشکل اقبال راشد، میرا جی اور مجید امجد تمام اہم شاعروں کو درپیش ہے۔ اقبال کو حضرت علامہ رحمتہ اللہ علیہ، شاعر مشرق مفکر و مصور پاکستان بنانے والوں نے انہیں ان کی جائز تفہیم اور مقام سے محروم کیا۔ ایسے لوگوں کو اقبال سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ انہوں نے اقبال کو اپنے بعض معاشی و معاشرتی مفادات کے حصول کا ذریعہ بنایا راشد کی شاعری کو مذہبی تعصبات کی عینک سے دیکھنے والوں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔ گذشتہ دس پندرہ سالوں سے رشتہ نقادوں کا ایک گروہ مجید امجد کو راشد کے مقام پر بیٹھانے کی تگ ودو میں مصروف ہے۔ یہ ویسے ہی لوگ ہیں جیسے وہ لوگ جو جوش صاحب کو اقبال کے مرتبے پر فائز کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کے سنجیدہ قاری اور نقاد کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

جوش صاحب بلند آہنگ شاعر ہیں۔ سطحی مطالعہ کرنے والے اس بلند آہنگی کو اقبال کی تقلید سمجھتے ہیں حالانکہ کہ یہ بلند آہنگی اقبال سے مختلف ہے۔ یہ بلند آہنگی راشد سے بھی مختلف ہے کیوں کہ جوش صاحب کی شخصیت اور مسئلہ ان دونوں شاعروں سے مختلف ہے۔ یہ بلند آہنگی بقدر جوہر اس شاعر میں نظر آتی ہے جو اس دور میں شعر کہہ رہا تھا اور اس کی شاعری اپنے عہد کے زندہ مسائل سے منسلک تھی۔ یہ بلند آہنگی ایک ایسے خطے کے شاعروں کی تھی جو عالمی استعمار کی وجہ پر تھا یہ اس دور کی ضرورت تھی جس میں اقبال، راشد، جوش اور ان کے دیگر ہم عصر شعر کہہ رہے تھے۔ یہ بلند آہنگی ہمیں جذوی طور پر حسرت اور یگانہ حتیٰ کہ کہیں کہیں فیض کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے لیکن اس بلند آہنگی کا انداز اور سطح ہر شاعر کے ہاں مختلف ہے۔ یہ بلند آہنگی جوش کی نظم میں زیادہ نمایاں ہے اور ان کی رباعی میں کم کم رباعی کی روایت اور عروضی آہنگ متقاضی تھے کہ اس میں بلند آہنگی کی سطح وہ نہ ہو جو انکی نظم کے لئے ناگزیر تھی۔

جوش سے قبل رباعی کے اسلوب و آہنگ پر صوفیانہ فکر، اخلاقی، موضوعات اور خمریات

کے اثرات نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف کا مروج آہنگ سرشارانہ ہے۔ اس آہنگ میں ایک تبدیلی یگانہ کی رباعیات میں ملتی ہے لیکن جوش صاحب نے اس صنف کے آہنگ کو بدل کر ہی رکھ دیا ہے۔ انہوں نے اس فن کو وہ وسعت دی ہے جس کی بنا پر ان کا شمار اردو کے چند اہم اور غایندہ رباعی گو شعرا میں ہوتا ہے اور یقیناً وہ جدید عہد کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر ہیں انہوں نے اس صنف شعر کا اسلوب آہنگ ہی تبدیل نہیں کیا بلکہ اس میں موضوعاتی وسعت بھی پیدا کی ہے اگر ہم ان کی نظم کو نظر انداز کر دیں یا ان کی نظم ہمیں دستیاب نہ ہو تو محض ان کی رباعی کے مرتب مطالعے سے انکی موضوعاتی وسعت تک رسائی ممکن ہے۔ نظم میں جن مقامات پر ان کی بلند آہنگی بیانیہ اور بعض مقامات پر نعرہ بازانہ ہے لیکن رباعی میں وہ مکمل تخلیقی رچاؤ کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے۔ جوش ایک دردمند دل رکھنے والے شاعر تھے ان کی نظم میں یہ دردمند کہیں بہت سطح پر ہے اور کہیں تہہ نیش ہے لیکن رباعی میں یہ دردمندی ایک خلاقانہ شان سے نمودار ہوئی ہے۔ اس دردمندی کے پس منظر میں مجموعی قومی صورت حالات کے ساتھ ایک ایسے تخلیق کار کا کرب بھی کارفرما ہے جو محسوس کرتا ہے کہ معاشرے نے اسکے تخلیقی جوہر کی کماحقہ پذیرائی نہیں کی اس دردمندی کے ظہور میں ہندوستان کی غلامی کا کرب، تقسیم کے نتیجے میں انسانی بہمیت کے مظاہر ہے اور شخصی مصائب نے اہم کردار ادا کیا ہے جوش صاحب ہر اعلیٰ درجے کے تخلیق کار کی طرح انتہائی خوددار انسان تھے جب کہ غیر تخلیقی معاشرے نے قدم قدم پر ان کی عزت نفس کو مجروح کرنیکی کوشش کی جوش صاحب کو اس کا بے پناہ ملال تھا۔ اس ملال کی جھلکیاں ان کی رباعیات میں جابجا نظر آتی ہیں لیکن نجوم و جواہر کے آخری حصے کرب سوال میں یہ درد بہت نمایاں ہے۔

آفاق پہ خندہ زن ہے جس کا ایوان
جس کے آگے نظام شمس حیران
بچو، شاہد رہو کہ میں نے تم پر
اس عزت نفس کو کیا ہے قربان

جوش کی شاعری کے دو بنیادی موضوعات میں ایک کی وجہ سے انہیں شاعر انقلاب

اور دوسرے کے حوالے سے انہیں شاعر رومان کے القابات دیے گئے۔ انقلابی شاعر میں ان کے لہجے کی گھن گرج موضوع کی مناسبت سے نمایاں ہے اور رومانی شاعری یہ لفظیاتی شکوہ کچھ دبتا ہوا سا ہے۔ جوش کی رباعی کا اسلوب اس جمال وجلال کے امتزاج سے مشکل ہوا ہے ان کے انقلاب پسندی میں ان کی دردمندی اور افتاد بلیغ کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے بھی گہرے اثرات ملتے ہیں انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس انسان کی جستجو کی ہے جو محکوم ومقہور ہندوستان اور اس سے قبل طویل جاگیرداری معاشرت میں میں گم ہو گیا تھا۔ جوش صاحب ملائیت سے اس لئے نفرت کرتے تھے کہ ملائیت نے ان انسانیت کش نظام کے استحکام میں خدمات انجام دی تھیں۔ وہ خدا کے خلاف نہیں اور نہ ہی دین کے لیکن انہوں نے ملا کے تصور خدا اور تصور دین کا جس غیر روایتی زبان میں ذکر کیا ہے اور بعض مقامات پر مضحکہ اڑایا ہے اس کی وجہ سے ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ بے دین اور ملحد تھے۔ اس تصور نے ان کی شاعری کی تفہیم کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کی ہے لیکن وقت کے ساتھ اب اس تصور کے خلاف لکھا جانے لگا ہے۔ یہ مشکل اقبال اور راشد کو بھی درپیش رہی ہے۔ اقبال شاعر اسلام کے منصب پر فائز ہو جانے کے بعد اس مشکل سے گذر گئے ہیں اور راشد کی شاعری کے اس حصے کے جس میں انہوں نے ملا کے تصور خدا ودین کے حوالے سے لکھا ہے بعض نقادوں نے مثبت تجربے کئے ہیں اور یہ گرداب چھٹتی جارہی ہے لیکن جوش کی شاعری کی تفہیم ابھی باقی ہے۔ اس عالمی اردو کانفرنس ۲۰۰۸ء منعقدہ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں بعض مضامین ایسے پڑھے گئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ضمن میں پیش رفت ہوئی ہے امید ہے کہ یہ کانفرنس جوش شناسی کے ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگی۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ اقبال اور راشد کی نسبت جوش کا لہجہ زیادہ جارحانہ اور زبان زیادہ سخت ہے لیکن 'جوش شناسی' اور 'جوش بانی' جیسے رسائل بھی اس حوالے سے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

رباعی ایک مشکل فن ہے اور ہر شاعر اس مشکل سے گذرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا خود جوش اس مشکل سے آگاہ تھے کہ اس فن کے لئے زیادہ ریاضت ناگزیر ہے یہی وجہ ہے کہ اردو میں

رباعی کی روایت غزل یا نظم جدید کی طرح بڑی نہیں ہے۔ اس فن کی ایک مشکل اس کا عروضی آہنگ ہے اور دوسری مشکل اختصار ہے۔ انہی دونوں مشکلات کی وجہ سے جدید اردو شاعری میں غزل کی روایت کمزور ہوئی ۔ جوش صاحب نے انہیں دونوں مشکلات پر اپنے فن کی بنیاد رکھی ہے۔ گویا انہوں نے اس مشکل کو ہی فن بنادیا ہے۔ اور وہ تخلیقی توانائی حاصل کی ہے جس نے انہیں اپنے عہد کا نمائندہ شاعر بنادیا ہے۔ رباعی کے مخصوص عروضی آہنگ نے ان کی بلند آہنگی کو تخلیقی رچاؤ سے آشنا کیا اور وہ ایک نیا شعری آہنگ دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس نئے آہنگ نے ان کے شعری اسلوب کی تشکیل میں بنیادی محرک کا کام کیا ہے اس آہنگ کی تشکیل میں انکی خاندانی نجابت اور تربیت کے ساتھ شعری مرتبے کا احساس بھی کارفرما ہے۔ جوش صاحب بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ وہ بڑے شاعر ہیں بڑی شاعری کے لئے اس احساس کا متوازن اظہار ناگزیر ہوتا ہے۔ مختلف مشاعروں میں کبھی یہ انکسار مبارزت، کبھی تعلیمی، کبھی غوغا آرائی، کبھی طنز اور کبھی موازنے کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا ہے جوش ی شاعری میں اس کا اظہار ایک الہامی شان سے ہوا ہے وہ اپنے تخلیقی جوہر کو کائنات کے دیگر تمام عناصر سے بلند مرتبت محسوس کرتے تھے۔

جوش کے اسلوب کی تشکیل میں ان کی لفظیات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ انہوں نے کتنے بے شمار الفاظ کا استعمال کیا ہے مجھے اس بات سے زیادہ غرض ہے کہ وہ لفظیات ان کے موضوع، ہیئت اور مزاج سے ہم آہنگ ہے یا اس کے اسلوب کے دیگر تمام عناصر سے اہم رشتہ ہو۔

فن پارہ ایک زندہ وجود ہوتا ہے اس وجود کے ظاہری اور باطنی تمام عناصر کا ہم رخ ہونا لازم ہوتا ہے ۔ جوش کی رباعی میں اسلوب کا یہ ظاہری و باطنی ربط مکمل ہے جس کی وجہ سے رباعیات وحدت میں پروئی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ۔ جوش کی فکر سے اختلاف رکھنے وا[illegible] ب نظر بھی ان کی رباعی کا اِنکار کرنے کا خوصلہ پیدا نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ متضاد نقطہ نظر کے باوجود جوش بہ طور شاعر آج بھی پورے تخلیقی طمطراق سے کھڑے ہیں اور ادب میں ان کی یہ موجودگی تادیر رہے گی بڑی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اختیار کردہ صنف کے

اسلوبیاتی ارتقا میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کرتی ہے۔ جوش نے رباعی کے اسلوب و آہنگ میں پہلی ہی نظر میں محسوس ہو جانے والے اضافے کئے ہیں۔ انہوں نے اس صنف شعر کے موضوع آہنگ اور لفظیات ہر سطح پر انقلابی تبدیلیاں کی ہیں۔ یہ محض تبدیلیاں نہیں ہیں بلکہ اس صنف کی روایت کا حصہ بن گئی ہیں۔

جوش ایسے شاعر نہیں ہیں جو مفرد تجربات پر قناعت کر لیتے ہیں۔ یہ بات ان کے مجموعی شعری مزاج سے متصادم ہے کیونکہ وہ شعر اس لئے نہیں کہتے تھے کہ شاعر بننا مقصد تھا بلکہ شاعری ان کے لئے زندگی کی تفہیم وتجدید کا ذریعہ تھی ان کے پاس کچھ تھا جو انہیں شعر کہنے پر مجبور کرتا تھا۔ ایسے شاعر مفرد تخلیقی تجربے کے بجائے مرتب و مربوط نظام فکر کو اپنی شاعری کی بنیاد بناتے ہیں۔ اگر یہ مرتب نظام فکر ان کے تخلیقی تجربے کے باطن میں جاری وساری ہو جائے تو جوش کی رباعیات جیسا فن ظہور کرتا ہے۔ اس فکری ارتباط کا اظہار ان عنوانات سے بھی ہوتا ہے جو 'نجوم و جواہر' میں قائم کئے گئے ہیں اور جہاں قائم نہیں بھی کئے گئے وہاں بھی واضح طور پر اپنا احساس دلاتے ہیں اس نقطہ نظر سے جوش کی رباعیات کا مطالعہ کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے انہوں نے چند موضوعات پر طویل نظمیں تخلیق کی ہیں ہر موضوع پر مختلف رباعیات کی حیثیت طویل نظم کے بندوں جیسی ہے۔ انہوں نے اسی طور پر رباعی کے اشعار کو وسعت آشنا کیا ہے۔

جوش صاحب بڑے شاعر اہیں بڑے شاعروں پر تنقیدی کام مسلسل جاری رہتا ہے۔ اقبال اور فیض کے بعد ان کی شخصیت اور شاعری پر ہونے والا کام دیگر تمام شاعروں پر ہونے والے کام سے زیادہ ہے۔ انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں میں ان پر مسلسل لکھا جا رہا ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ اب بہت سے غیر ادبی تصورات بھی باطل ثابت ہو رہے ہیں۔ اس لئے امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے زمانوں میں جوش شناسی درست بنیادوں پر استوار ہو سکے گی۔

☆☆☆

یادوں کی بارات

بیگ احساس

''یادوں کی بارات'' سے قبل اور اس کے بعد بے شمار خودنوشتیں لکھی گئیں لیکن جو مقبولیت یادوں کی بارات کو حاصل ہوئی اور جتنے اعتراضات اس پر کیے گئے شاید ہی کسی کتاب پر کیے گئے ہوں۔

حد یہ کہ اس خودنوشت کا تیسرا ایڈیشن جو ۱۹۹۰ء میں شانِ ہند پبلی کیشنز، دہلی نے شائع کیا۔ اس کے فلیپ پر جو رائیں ہیں وہ ماہر القادری اور عبدالماجد دریا آبادی کی ہیں۔ حالاں کہ فلیپ پر تعریفی کلمات شائع کیے جاتے ہیں۔ ماہر القادری کی رائے ہے۔

> ''جوشؔ صاحب افسانہ طراز ہی نہیں گپ ساز بھی ہیں۔ میر جعفر زٹلی آج زندہ ہوتے تو جوشؔ صاحب کے آگے کان ٹیک کر استاد زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ اپنی شخصیت کے بارے میں عجوبگی اور انوکھا پن پیدا کرنے کے لیے جوشؔ صاحب نے یہ باتیں لکھی ہیں۔ میرے شیر نے شاید یہ قسم کھا رکھی ہے کہ جو بات بھی لکھوں گا اس میں اصلیت اگر ہو سکی تو بقدر نمک ہوگی۔ باقی مبالغہ، نمک مرچ، افسانہ، طرازی اور دروغ بیانی۔''

وحید اختر جیسے روشن خیال نقاد لکھتے ہیں ''جہاں تک فحش لطائف، عریاں نگاری، جنسی تجربات اور لذت کوشی کی ترجمانی کا سوال ہے شاید جوشؔ سے زیادہ اُردو میں کوئی دوسرا اس کا حق

ادا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جوشؔ واہل اُردو سے مردانگی کی کمی کی شکایت ہے اسی لیے ہو بہت سی باتوں کو ناگفتنی چھوڑ گئے ہیں، جس کا انھیں قلق ہے مگر جتنا کچھ ان کے قلم سے گفتنی بنا ہے وہی شاید ہماری تہذیب کی ریا کاری اور نقاب درنقاب طرز بیان کے لیے مشکل ہی سے قابل قبول ہوگا۔''

شدید مخالفت اور اس آپ بیتی کو''جھوٹ کا پلندہ'' کہنے کے باوجود یادوں کی برات سب سے زیادہ دلچسپی سے پڑھی جانے والی آپ بیتی ہے۔

''یادوں کی برات''پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس کی صداقت مشکوک ہے۔ اس میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اگر اس آپ بیتی کو جوشؔ عہد کے آئینے میں دیکھا جائے تو کوئی بھی واقعہ نہ قابل یقین نہیں رہ جاتا۔ یہ مبالغہ جوشؔ کے عہد کی شناخت تھا، جہاں ہر شخص باون گز کا ہوتا تھا۔ آج بھی آپ یو۔ پی کے کسی شخص سے بات کیجئے وہ اپنا تعلق ایسے جاگیردار گھرانے سے بتائے گا جو اپنی لاپروائیوں، سخاوت دریا دلی اور ناعقبت اندیشی کی بناء پر جاگیر سے محروم ہو گیا ہے۔ جوشؔ اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔

۷۸۲ صفحات کی اس آپ بیتی کا کینواس بہت وسیع ہے۔ تحریک آزادی سے لے کر مشرقی پاکستان تک۔ مہاتما گاندھی سے ذوالفقار علی بھٹو تک۔ جاگیرداری سے سمینٹ کی ایجنسی تک اور ملیح آباد سے کراچی تک یہ آپ بیتی پھیلی ہوئی ہے۔

تکنیک کے اعتبار سے بھی آپ بیتی ابتداء میں داستانی رنگ میں لکھی گئی ہے۔ اس کے کردار اور فضا تخیلی لگتے ہیں۔ ایک سحر انگیز ماحول ہے۔ لکھنؤ کے بازاروں اور کوٹھیوں کی تفصیلات، حیدر آباد شہر کا بیان طوائفیں، شاعری کی محفلیں، داستانی شہزادوں کی طرح مرکزی کردار کو بھی خوابوں میں بشارت ہوتی ہے۔ ایک مہم کے بعد دوسری مہم، قصہ در قصہ۔ لیکن حیدر آباد سے بمبئی پہنچتے پہنچتے یہ پراسرار فضا ختم ہو جاتی ہے اب نہ وہ مبالغہ ہے نہ افسانوی شہر سیدھا سیدھا حقیقتوں کا بیان ہے ناول جیسا۔ پھر ہمیں بہترین شخصی خاکے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ پاکستان کی سیاسی فضا سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے یہ آپ بیتی داستان، ناول، رپورتاژ اور خاکہ نگاری کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔

جوشؔ صاحب کی شخصیت نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ ایک ہنگامی دور تھا۔ ایک تہذیب دم توڑ رہی تھی اور دوسری تہذیب نے اپنے قدم جما لیے تھے۔ انگریزوں کا چل چلاؤ تھا۔ آزادی کی تحریک نے ہندو مسلمان کو متحد کر دیا تھا۔ ریاستیں ابھی باقی تھیں۔ ان ریاستوں میں مجہول لیکن مطلق العنان بادشاہ تھے۔ اس عہد کے بارے میں جوشؔ لکھتے ہیں:

> ''تہذیبی اعتبار سے اس وقت ہندوستان دوراہے پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ مشرقیت پر قائم رہے یا مغربیت کی طرف مڑ جائے؟ ملک اس وقت خالص مشرقی، نیم مشرقی اور مغربی ان تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''فرنگیوں کے نقیب پنڈت مدن موہن مالویہ اور سر سید احمد خاں اپنے اپنے چیل چاپڑوں کے ساتھ مغربیت کے فروغ کی سعی کر رہے تھے لیکن اس وقت تک مشرقیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ مغربیت ہر چند اُبھرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ مگر قومی مشرقیت اس کا گلا دبائے ہوئے تھی اور سوٹ پہننے والوں کو ''پلپلی صاحب'' کہا جاتا تھا۔ (ص ۱۸۶)

جوشؔ نے اس آپ بیتی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) چند ابتدائی باتیں (۲) میرا خاندان
(۳) میرے چند قابل ذکر احباب (۴) میرے دور کی چند عجیب ہستیاں
(۵) میرے معاشقے

ہر ایک باب کے ذیلی عنوانات بھی ہیں۔ آپ بیتی پہلے حصے میں ختم ہو جاتی ہے باقی شخصی مرقعے ہیں۔ ان شخصیات میں افرادِ خاندان، قابل ذکر احباب، چند عجیب، ہستیاں اور محبوبائیں ہیں۔ آخری حصے میں معاشقوں کا ذکر ہے۔ ابتدائی حصے میں جوشؔ اپنے کمزور حافظے کا اقرار کرتے ہیں اور ثبوت میں دو واقعات پیش کرتے ہیں لیکن انھیں اپنی بسم اللہ اور ختنہ کی تقریبات کی تفصیلات یاد ہیں اور یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ آدمی کے حافظے میں ماضی کی ایک

تفصیل تازہ رہتی ہے اور کبھی وہ بالکل سامنے کی بات بھول جاتا ہے۔ جوشؔ نے اپنی زندگی کے چار میلانات کی نشاندہی کی ہے شر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسانی دوستی!! اور جوشؔ نے ان میلانات کو Justify کرنے کی کوشش کی ہے۔

جوشؔ اپنے خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے خون میں دُرہ خیبر کی شعلہ بار دوپہر مچلتی رہی اور ہمارے سروں پر اودھ کی سلونی شام گل باریاں کرنے لگی اور ملیح آباد، لکھنؤ کی شائستگی و تہذیب اور قبائلی علاقوں کی بربریت و وحشت کا عجیب نقطہ اتصال بن گیا۔''

جوشؔ نے اپنے مزاج کو مجموعہ اضداد ثابت کیا۔ شاید وہ اُن کے خون کی تاثیر تھی۔ وہ مختلف واقعات لکھتے ہیں جن میں وہ ایک طرف سریع الاشتعال ہیں تو دوسری طرف دوسروں کے کام آنے والے صاحبِ مہر و وفا۔ وہ اپنی شخصیت کے دونوں رُخ کامیابی سے اُبھارتے ہیں۔ اپنے ملازم کے لیے ملائی فراہم کرنا، ماں کی چمپا کلی چھڑا کر اسے پیسے دینے کی کوشش کرنا۔ انا اور کھلائی سے محبت کرنا۔ دوسری طرف بزرگوں کی داڑھی نوچ لینا، مالی کے لڑکے کے سلام نہ کرنے پر فائر کر دینا۔ مزاج کی گرہیں کھلتی ہیں۔ ابتدائی حصہ غیر ضروری طور پر طویل ہے۔ حویلی کی اندرونی اور بیرونی سجاوٹ، بسم اللہ وختنہ کی رسمیں، موسموں اور تہواروں کی تفصیلات، لکھنؤ کے بازاروں، کوٹھے والیوں کا تزکرہ، قفلیوں کی لذت کا بیان، کھانوں کی قسمیں، روٹیوں، کباب، مٹھائیوں کے بیان میں وہ رجب علی، بیگ سرور اور رتن ناتھ سرشار سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ ان واقعات کے انبار اور جزئیات کے ڈھیر سے جو تصویر جوشؔ کی اُبھرتی ہے وہ ایک ایسے شخص کی ہے جو نرگسیت کا شکار ہے۔ وہ خود پر عاشق ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں ذرا مڑ کر اور ایک قد آدم آئینے کے سامنے جا کر اپنا منہ دیکھنے لگا۔ گالوں پر سرخی کے ہلکورے، آنکھوں میں گلابی ڈورے۔ چھریرا بدن، پتلی کمر، گھنیرے بال، پتلے پتلے ہونٹ لانبی لانبی پلکیں۔ بر میں ریشمی کرتہ،

> کرنے پر روئی بھری مخملی صدری، سر پر آڑی جرنیلی ٹوپی، ٹوپی کے گرد، آگرے کا سنہرا فیتہ اور داہنے کان میں ہلتا ہوا سونے کا جھلا جھل، دُر، اُف میں کس قدر حسین ہوں۔ زندگی میں پہلی بار اس کا پتہ چلا۔ اللہ بھلا کرے طلوعِ صبح کی رنگینی کا، جس نے میرا پوشیدہ اجمال مجھ پر آشکار کردیا۔ (ص ۵۰)

جوشؔ خود اپنی ذات کے اسیر اور خود اپنے آپ عاشق تھے۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو اپنے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جوشؔ صاحب کی جو شخصیت اُبھرتی ہے وہ ایک ایسے شخص کی ہے جسے اپنے آبا واجداد سے بے پناہ عقیدت ہے۔ وہ اپنی دادی، ماں اور باپ کا بے پناہ احترام کرتا ہے۔ انھیں بے حد چاہتا ہے لیکن جب ماں یہ کہتی ہے کہ "ننھے تمھارے باپ میرٹھ والی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، میں سوتیا ڈاہ سہہ نہ سکوں گی۔ مجھے میرے باپ کے گھر پہنچا دو ورنہ میں سنکھیا کھا کر سو جاؤں گی تو وہ اپنی ماں کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔ چالاکی سے چچا سے پیسہ حاصل کرتے ہیں۔ کمپارٹمنٹ بک کرواتے ہیں اور خطرہ مول لے کر ماں کو نانا کے گھر پہنچاتے ہیں اور ان کے والد جب غلط فہمی دُور کرتے ہیں تو خسر سے کہتے ہیں کہ اگر ایسی افواہ سن کر وہ (بچے) اپنی ماں کی مدد نہ کرتے اور ان کو آپ کے قدموں تک نہ پہنچاتے تو میں ان کی شرافت سے مایوس ہو جاتا۔ یہ سمجھ لیتا کہ جو بچے اپنی ماں کے وفادار نہیں وہ میرے کیا ہو سکتے ہیں" (ص ۱۳۴)

جوشؔ نے اپنے والد کی موت زندگی کا سب سے بڑا سانحہ قرار دیا۔ جوشؔ کے والد کا انتقال صرف بیالیس برس کی عمر میں ہوا تھا۔ جوشؔ کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی اپنے باپ کی قبر میں دفن ہو جائیں۔ اپنے والد کے انتقال کے چند دنوں بعد ان کی شادی ہوئی۔ وہ شادی کی خوشی بھی نہیں منا سکے۔ جوشؔ ایک اچھے بھائی بھی ثابت ہوتے ہیں۔ جائیداد کی تقسیم میں وہ ایک بڑے حصے سے محروم ہو جاتے ہین لیکن بھائیوں سے جھگڑا نہیں کرتے۔ وہ جائیداد کی تقسیم کے سلسلے میں حماقت کرتے ہیں اور اپنی اس حماقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ وہ انگریزوں سے نفرت کی وجہ سے اچھی ملازمت قبول نہیں کرتے، بہت جذباتی ہیں، یہی جذباتیت انھیں خدا سے انحراف پر مجبور

کرتی ہے۔ایک بڑھیا کوسات روپیوں کی خاطر ہر مہینے موسم کی سختیاں جھیل کر ایک لمبا فاصلہ طے کرتے دیکھ کر وہ سوچتے ہیں:

''اللہ کے کروڑوں بندے در در کی ٹھوکر کھاتے پھرتے، بھوک سے ایڑھیاں رگڑ کے مرتے یتیم بچے ایک ایک کا منھ دیکھتے رہتے، بوڑھے باپ جوان بیٹوں کے جنازے اُٹھاتے، کم سن بیواؤں کو رنڈ سائے پہنائے جاتے، بوڑھی اور بے آسرا بیواؤں کے جوان اور کماؤ بچے ان کی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے، سانپ انسانوں کے ڈستے، درندے ان کی ہڈیاں جھنجھوڑتے، سیلابوں میں شہر کے شہر بہہ جاتے، قحط کی شدت سے مائیں اپنے بچوں کو بھون بھون کر کھا جاتیں، وبائیں سینکڑوں گھروں کو بے چراغ کر دیتیں، زلزلوں کی کروٹوں میں ہزاروں شہر دب دب کر ہر جاتے ہیں۔ میری چشم تصور نے یکا یک پھر یہ تماشا دیکھنا شروع کر دیا کہ یزید، شمر، نادر، نیرو، چنگیز، مسولینی اور ہٹلر خونِ انسانی کے دریاؤں میں اپنی رنگینوں کے جہاز چلا رہے ہیں۔ فاتح اپنے مفتوحوں کی لاش اور قالین بچھا بچھا کر فتح کے جشن منا رہے ہیں جواں مرد احتیاط سے تنگ آ کر بزدلوں کے رو برو جھک رہے ہیں۔ محمدؐ کے دانت شہید ہو جانے کے بعد خون بہہ رہا ہے اور محمدؐ کے نواسے حسینؑ کو اس کے بچوں اور ساتھیوں سمیت تپتی زمین پر لٹا لٹا کر پیاسا ذبح کیا جا رہا ہے۔ یہ سارے تماشے ہو رہے ہیں خدائے بزرگ و برتر کی آنکھوں کے سامنے۔ جو عادل ہے، حکیم ہے، رحیم ہے۔ رؤف ہے اور رزاق ہے۔ اور جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا اور اس کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بندوں کی دردمندی اور اللہ کی بے مہری کا تصور قوی سے قوی ہوتا گیا''۔ (ص ۱۷۵۔۱۷۶۔۱۷۷)

وہ تقلیدی نہیں بلکہ تحقیقی ایقان کے قائل تھے۔ وہ آنحضرتؐ، حضرت علیؓ، امام حسینؓ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ سقراط، مزدتک، زرتشت، گوتم بدھ، مہاویر، تلسی داس، کنفیوشس، مسیح، کبیر داس، گرونانک، مارکس، لینن، نٹشے اور برٹنڈرسل کے بھی شیدائی ہیں لیکن ان کے ہم خیال اور اُن کے پیرو نہیں ہیں۔

وہ خواب میں حضرت علیؓ، آنحضرت، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو دیکھتے ہیں۔

خواب ہی میں انھیں اپنے والد کی موت کا پتہ چلتا ہے، خواب ہی میں حضورؐ اُنھیں حیدر آباد جانے کا اشارہ کرتے ہیں اور خواب ہی میں خواجہ اجمیریؒ انھیں اپنے روضے پر آنے کے لیے مدعو کرتے ہیں۔ خواب خالص ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ جوشؔ نے واقعی خواب دیکھے تھے یا نہیں۔۔۔؟

جوشؔ کی ہر بات کو مبالغہ اور غلط بیانی سے تعبیر کیا گیا۔ حیدر آباد کے سلسلے میں بھی ان کی بعض غلط بیانیاں ثابت ہو چکی ہیں لیکن اس سے قطع نظر اگر غور فرمائیں تو جوشؔ ایک حق گو اور احسان مند انسان کے روپ میں اُبھرتے ہیں۔ حیدر آباد نے کتنے ہی مشاہیر ادب کو روزگار ہی مہیا نہیں کیا بلکہ ان کی آسائش کا سامان بھی کیا۔ مولوی عبدالحق کس طرح پاکستان چلے گئے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ مشاہیر ادب نے جب بھی موقع ملا حیدر آباد کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کبھی احسان مندی کا اظہار نہیں کیا۔ یگانہ چنگیزی سے لے کر صدق جائسی تک سب کا یہی رویہ رہا۔ لیکن جوشؔ نے جگہ جگہ حیدر آباد اور نظام حیدر آباد کے احسانوں کا ذکر کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اے حیدر آباد میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھ کو دس برس تک اپنے سائے میں پروان چڑھایا تو نے مجھ کو کبھی غیر ملکی نہیں سمجھا تو نے مجھ کو کتب بینی کو دعوت دی، تو نے میری شاعری کو آب و رنگ بخشا، تو نے مجھے علم و فکر کا رستہ دکھایا تو نے مجھے کتاب اور کائنات کے مطالعے پر مامور فرمایا کتاب نے میری آگاہی میں اضافہ کیا کاکلوں کی چھاؤں نے مجھ کو جمالیاتی شاعری کا خزانہ بخشا، کائنات کے مسائل نے مجھ میں تفکر کا مادہ

پیدا کیا۔ تفکر نے میرے علم میں اضافہ کیا، علم کے اضافے نے مجھ پر یہ تلخ
حقیقت عیاں کر دی کہ میں سراسر جاہل ہوں اور اس عرفان جہل نے مجھ کو
وادیٔ حیرت کی جانب موڑ دیا"۔ (ص ۲۲۸)

جن لوگوں نے ان کا ساتھ دیا وہ سب کا ذکر بڑی احسان مندی سے کرتے ہیں وہ لکھتے
ہین "میں جب حیدر آباد چلا گیا تھا اور سر اکبر حیدری کی سی طاقتور شخصیت سے بگاڑ پیدا ہونے کے
بعد جب میرے پنپنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی اس وقت نظام میری خاطر ایک جدید و غیر
ضروری عہدہ خلق کر کے مجھے برسر روزگار بنا دیا تھا۔

جب دکن سے میرا اخراج ہوا تھا اس وقت سردار روپ سنگھ اور سروجنی نائیڈو نے میری
مدد کی تھی۔ اس کے بعد شیو نرائن نے ہاتھ بٹایا تھا اور جب شیو نرائن نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اس وقت
مہارلجہ پٹیالہ میری پشت پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ جب بمبئی میں نانِ شبینہ سے محروم ہونے کا
وقت سر پر آ پہنچا تھا اس وقت پنڈت نہرو نے میری دست گیری کی تھی"۔

جوشؔ اپنے اٹھارہ معاشقوں کے بار بار تذکرے کے باوجود ایک محبت کرنے والے
شوہر کے روپ میں اُبھرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بیوی کی سلیقہ مندی، ان کی کتابیں چھپوانے کا
سلسلے میں عرق ریزی اور ان کی وفا شعاری کی جگہ جگہ تعریفیں کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"میری غروب ہوتی ہوئی زندگی کا سب سے زیادہ دردناک سانحہ میری
بیوی کا دماغی خلل ہے"۔

جوشؔ ایک محبت کرنے والے باپ بھی ہیں۔ ان کے پاکستان جانے کی سب سے
بڑی وجہ بچوں کا مستقبل اور تہذیبی و لسانی بربادی کا خوف تھا۔ نقوی صاحب نے ان سے کہا تھا
کہ "آپ کے بعد ہندوستان میں آپ کے بچے در در مارے پھریں گے اور ایک متنفس بھی ان
کے سر پر ہاتھ نہیں رکھے گا۔ جوشؔ صاحب آپ کے بچے اُردو بھول جائیں گے۔ ہندی ان کی
اُوڑھنا بچھونا ہوگی وہ آپ کے کلام کا ترجمہ ہندی میں پڑھیں گے اور تہذیبی، روایتی اور ثقافتی
اعتبار سے آپ کی پوری نسل میں اس قدر زبردست و عبرت ناک تبدیلی پیدا ہو جائے گی کہ آپ

سے اس کا کسی نوعیت کا بھی تعلق باقی نہیں رہ جائے گا، کیا یہ کہ عظیم لسانی، مزاجی اور روایتی بربادی آپ کو منظور ہے؟ (ص ۲۷۹)

لیکن پاکستان جانے کے بعد بچوں کا جو حشر ہوا؟ ان کی بیٹی سعیدہ کم عمری میں بیوہ ہوگئی نو بچوں کی پرورش کرنا کوئی معلمولی بات نہیں تھی۔ وہ اسی میں تباہ ہوگئیں۔لڑکا سجاد چھوٹی موٹی ورک شاپ چلاتا تھا۔وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اجداد کی تلوار پگھلا کر قلم بنالیا تھا، میرے بیٹے نے میرے قلم کو ہتھوڑے میں ڈھال لیا ہے ہائے میرے خاندان کا وہ عروج اور وائے یہ زوال''۔

اور تہذیب و کلچر کا جو حشر پاکستان میں ہوا اس کے بارے میں پنڈت نہرو نے جوشؔ سے طنز کے ساتھ کہا تھا:

> ''جوشؔ صاحب، پاکستان کو سلام، اسلامی کلچر اور اسلامی زبان، یعنی اُردو کے تحفظ کے واسطے بنایا گیا۔لیکن ابھی کچھ دن ہوئے میں پاکستان گیا اور وہاں دیکھا کہ میں تو شیروانی اور پاجامہ پہنے ہوئے ہوں لیکن وہاں گورنمنٹ کے تمام افسر سو فیصدی انگریزوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔مجھ سے انگریزی بولی جارہی ہے اور انتہا یہ ہے کہ مجھے انگریزی میں ایڈریس دیا جارہا ہے۔مجھے اس صورت حال سے بے حد صدمہ ہوا اور میں سمجھ گیا کہ اُردو اُردو کے جو نعرے ہندوستان میں لگا گئے وہ سارے اُوپری دل سے اور کھوکھلے تھے۔اور ایڈریس کے بعد جب میں کھڑا ہوا تو میں نے اس کا اُردو میں جواب دے کر سب کو حیران و پشیمان کردیا۔ یہ بات ثابت کردی کہ مجھ کو اُردو سے ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ محبت ہے''۔

جوشؔ صاحب ایک محبت کرنے والے شوہر اور فرض شناس باپ ہی نہیں ایک عاشق مزاج آدمی کے روپ میں بھی اُبھرتے ہیں۔انھوں نے اپنے اٹھارہ معاشقوں کا تذکرہ کیا ہے اور

تیسرے ایڈیشن کا اختتام بھی عشق پر ہوتا ہے اور یہ عشق انھوں نے ۱۹۷۴ء میں یعنی ۶۸ برس کی عمر میں کیا۔ جوش صاحب کے معاشقوں پر انھیں حیرت ہوتی ہے جن کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی ورنہ مجھے تو ان کے ۶۸ برس کی عمر والے عشق پر بھی پورا یقین ہے۔ ہاں اپنے معاشقوں کے تذکرے میں انھوں نے واقعات کو زیادہ ڈرامائی بنا کر پیش کیا اور یہ جوش صاحب کا فطری اسلوب ہے۔

جوش صاحب ایک بے باک شخص تھے۔ پاکستان میں ڈکٹیٹر شپ کے باوجود انھوں نے جس بے خوفی سے وہاں کی سیاست پر لکھا وہ کسی معمولی آدمی کا کام نہیں ہے۔ جوش ایک بت شکن شاعر تھے۔ انھوں نے اقبال اور سر سید کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، اس میں بڑی حد تک سچائی بھی نظر آتی ہے۔ سر سید کے بارے میں لکھتے ہیں۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج پہ مسلمانوں کو غیر اسلامی خطاب دینے والا غلامانہ انگریزی نام اس کالج کے بانی اس سید احمد نے (جن کے کاسۂ سر میں، 'سر' کا خطاب جس کا ہندوستان شکار تھا، اپنا آشیاں بنا چکا تھا)۔ دراصل علی گڑھ تحریک اُٹھائی ہی گئی تھی اس غرض سے کہ (۱) مسلمان کا دل ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بے تعلق ثابت کر کے اس امر پر مہر تصدیق کر دی جائے کہ مسلمان کا دل حب وطن کی سی ذلیل چیز سے قطعی آلودہ نہیں ہے (۲) مسلمان کو پیٹ پالنے کی خاطر فقط اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ بابو یا ڈپٹی کلکٹر بن کر بڑا بابو بن سکے (۳) اپنی زبان کو فراموش کر کے انگریزی میں اس قدر غرق ہو جائے کہ وہ انگریزی میں سوچے اور انگریزی میں خواب دیکھے (۴) وہ مغربیت اختیار کر کے مشرق سے اس قدر بے زار ہو جائے کہ اپنی زبان اپنے ادب اپنے روایات اپنی ثقافتی وراثت کو ذلیل اور یہاں تک کہ اپنے باپ دادا تک کو احمق سمجھنے لگے (۵) ادھر اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حکومت برطانیہ کو دوام حاصل ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خراجِ روزگار کی کارفرمائی کی بدولت اس شر سے خیر اور اس نقصان سے کچھ فائدے کے پہلو نکل آئے لیکن جب آخری حساب کتاب کے بعد ''میزان کل'' کو نوبت آئی تو پتہ چلا کہ اس کاروبار میں نفع بہت کم گھاٹا بہت زیادہ ہوا۔ (ص ۱۳۶)

اقبال کے سلسلے میں ان کا خیال ہے:

''چوں کہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے اور بلا کے ذہین انسان تھے اس لیے شروع شروع میں انھوں نے مغرب کے الحاد اور مشرق کے مابین مصالحت کی بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی لیکن جب ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی تو انھوں نے نٹشے کے مافوق البشر کو مشرف بہ اسلام کرکے ''شاہین بچہ'' بنا دیا۔ قرآن کے مردود لفظ عشق کو آسمان پر چڑھا کر اسے تمام انسانی شرف و مجد کا مرکز تسلیم کیا اور قرآن کے محبوب لفظ ''عقل'' کو خاک میں ملا کر، اس کو تمام مفاسد کا سرچشمہ ٹھہرایا''۔

(ص ۱۷۳)

جوشؔ میں اس بات کا حوصلہ تھا کہ جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں اس کا بلا خوف اظہار کریں ''میرے عنفوانِ شباب تک کا ہندوستان'' میں جوشؔ نے اس دور کی تہذیب و ثقافت کی تصویر کھینچی ہے۔ اس دور کے لباس، سواریاں، پیشے، کھیل کود، غذائیں، مٹھائیاں، سوپ، فرش، زیوارت اور اقدار کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ میر امن، رجب علی بیگ سرورؔ اور رتن ناتھ سرشارؔ سے کسی طرح کم نہیں۔ اس پہلو کا تفصیلی جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں۔ اسی طرح ان کے شخصی خاکوں پر بھی ایک علاحدہ مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ ان خاکوں میں خاکہ نگاری کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ جوشؔ نے سب سے زیادہ انقلابی نظمیں لکھیں جن لوگوں نے یہ نظمیں پڑھیں انھیں گرفتار کیا گیا لیکن جوشؔ کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔

وہ لکھتے ہیں:

''اسی زمانے میں تیج بہادر سپرو نے یہ کہہ کر میری گرفتاری کو رکوادی تھی کہ اگر میری پکڑ دھکڑ ہوگئی تو میں سیاست کے میدان کا عملی آدمی بن کر خطر ناک ہو جاؤں گا۔ معلوم نہیں یہ خبر جھوٹ تھی یا سچ مگر واقعہ یہ ہے کہ میری گرفتاری کی اجازت نہ دی ہو۔ انگریز محبانِ وطن کی دل ہی دل میں قدر

کرتا تھا''۔(ص۲۶۱)

غرض جوش کی شخصیت ایک ایسے انسان کی ہے جو جاگیردارنہ نظام کا پروردہ ہے جسے اپنے آباواجداد پر فخر ہے اور جو پہلا ترقی پسند شاعر ہے۔ جو انگریزوں سے متنفر ہے لیکن ان کی شرافت کا قائل بھی ہے۔ جو بے باک ہے لیکن ڈرپوک بھی ہے۔ جو شراب پیتا ہے لیکن شراب سے نفرت کرتا ہے۔ جو خدا سے منکر ہے لیکن حضور حضرت علی اور امام حسین سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہے۔ جو شاہی سے نفرت کرتا ہے لیکن ان کے وظائف قبول کرتا ہے۔ جو بے شمار معاشقوں میں گرفتار ہے لیکن بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھاتا ہے کہ اس کے تعلقات کسی دوسری عورت سے نہیں ہے۔ جو خلافت کمیٹی کے اہم اجلاس میں جہاں حسرت نے مکمل آزادی کا اعلان کیا ہے۔ یہی تضادات جوش کو ایک عام انسان اور سوانح عمری کو دلچسپ بناتے ہیں۔

مری نظر میں جوش ایک ایسا قابل رحم کردار ہے جو تقسیم ہند کا شکار ہوگیا۔ ہمارے ادیبوں نے ہجرت کے کرب کو موضوع بنا کر صفحات سیاہ کیے خود کو اسٹابلش کیا۔ پاکستان میں بھی بڑے عہدوں پر رہے اور ہندوستان میں بھی ہاتھوں ہاتھوں لیے گئے۔ لیکن جوش جیسے بھی کئی کردار ہیں جو نہ ہندوستان کے ہو سکے اور نہ پاکستان نے جنھیں قبول کیا۔ جوش کی خود نوشت سے تقسیم کے المیے کا یہ پہلو اُبھرتا ہے۔ اب جب کہ ہم اس صدی کے آخری سال میں قدم رکھ چکے ہیں مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ''یادوں کی برات'' اس صدی کی ایک اہم کتاب ہے۔(۱۹۹۹ء)

☆☆☆

یادوں کی برات

احمد عقیل روبی

'داغستان' والے رسول حمزہ توف نے کہا ہے کہ جوان بکرا جب بکریوں کے ریوڑ کو لے کر چراگاہ کی طرف روانہ ہوتا ہے تو اسکی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ سب بکریاں اسے محبت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اس کے قریب بیٹھنے کے لئے ایک دوسری سے لڑتی جھگڑتی ہیں لیکن جب بکرے کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں اگلے دو دانت ٹوٹ جاتے ہیں آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے تو دوسرا جوان بکرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ چرواہا اسے درخت کے نیچے باندھ دیتا ہے جہاں وہ کان پھڑ پھڑا کر اپنی آنکھوں کے گرد منڈلاتی مکھیوں کو اڑاتا رہتا ہے اور قصائی کے انتظار میں ہری بھری چراگاہوں کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور ان دنوں کو یاد کرتا ہے جب وہ سلطان تھا۔ اور بکریوں کی آنکھ کا تارا ہوا کرتا تھا۔ رسول حمزہ توف کے نزدیک ایک بڑے شاعر کا انت بھی یہی ہوتا ہے۔ جب اچھے دن ہوا ہو جاتے ہیں داد و تحسین کے شادیانے دم توڑ جاتے ہیں تو وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ گئے دنوں کے ڈھیر سے چن چن کر یادوں کی سبھا جمائے اور اپنی تنہائی کا دل بہلائے۔ جوش صاحب نے یہ بات بہت پہلے سمجھ لی تھی جس نے ان سے 'یادوں کی برات' لکھوالی۔ یادوں کی برات ۷۵ سالہ ایک عظیم اردو شاعر کی یادداشتوں کی پوٹلی ہے جسے وہ اپنے آخری پڑاؤ پر اپنے سامنے سجا کر بیٹھا ہے یاد کی ایک ایک کترن اٹھا کر آنکھوں سے لگاتا ہے اور پیروں سے چوم چوم کر سفر کی تکان دور کرتا ہے جوش صاحب نے ایک بھرپور زندگی گذاری۔

گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ جس ندی پر جی چاہا اشنان کیا جس محفل میں بیٹھے جان محفل ٹھہرے۔ جس محفل سے اٹھے داستان چھوڑ آئے...... کہیں عزت سے بلائے گئے کہیں سے بے آبرو ہو کر نکلنا پڑا۔ راجہ مہاراجہ، حکمرانوں اور وزیروں کی آنکھوں کے تارے بن کر رہے۔ دن رات محبوباؤں کا ہجوم دائیں بائیں رہا بقول ان کے ماتھے پر ہونٹوں کے چاند اترے زلفوں سے پاؤں پونچھے گئے۔ منہ میں سونے کے چمچ لے کر پیدا ہوئے۔ عروج دیکھا اور پھر زوال کا مزہ چکھا۔

یادوں کی برات' ان کے اسی ۷۵ سالہ سفر کی دلچسپ داستان ہے۔ عہد زوال میں عروج کے زمانے میں کھینچی گئی تصویروں کا البم ہے۔ جسے اردو کا عظیم شاعر بیوی سے دور بجھے تخت پر بیٹھا دیکھ رہا ہے اور سر کے بال نوچ نوچ کر رو رہا ہے۔ جھنجلاہٹ ہے کہ وہ دن کہاں گئے۔ غصہ ہے کہ جوانی اسے بوڑھاپے کے ہاتھوں بیچ کر کہاں چلی گئی۔ یادیں بھی ہیں کہ اوپر تلے ہجوم در ہجوم چلی آ رہی ہیں۔ پردادا، دادا، ماں باپ کی یادیں۔ اپنی پیدائش بچپن پہلا سفر آغاز تعلیم، نکاح، پہلا مشاعرہ، موسم برشگال، ہولی، دیوالی، شب برات، رمضان، عید، بقرعید، محرم علی جان کا مجرا۔ ۱۴ برس کی طوائف کے کچے گلے میں گھومتا پُروا کا ملائم جھونکا۔ پہلا عشق پھر مسلسل عشق ملازمت، حیدر آباد سے اخراج، پنڈت نہرو کی محبت، مولانا آزاد کی بے رخی، پاکستان میں آمد شان الحق حقی کی مخالفت بابائے اردو کی بے رخی، خوابوں کا چکنا چور ہونا۔ بیٹے سجاد کا ورکشاپ کھولنا، جوش صاحب کا واویلہ۔ یادوں کا ہجوم بڑھا تو جوش صاحب گھبرا گئے۔ آخر اس گھبراہٹ سے بچنے کا ایک گر ہاتھ آیا۔ کاغذ سامنے رکھا قلم ہاتھ میں تھاما اور یادوں کو سلسلے وار ترتیب دے کر کتاب بنا دیا اور اردو نثر کو چار چاند لگا دیئے۔

ورڈزورتھ نے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اسے past memories recollected in tranquility کا نام دیا۔ جس تنہائی کا ورڈزورتھ نے ذکر کیا ہے۔ جوش صاحب کے پاس وہ بے شمار تھی اور تنہائی میں ان پر نازل ہونے والا عذاب بے انت، اس کیفیت کو وہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

آفتاب غروب ہو جانے کے بعد جب میرے طلوع ہونے کا وقت آتا ہے تو اس شبھ

گھڑی دل سے آواز آنے لگتی ہے کاش چند فلسفی یا شاعر یا ادیب میرے ہم نفس ہوتے اور گل افشانی گفتار سے میرا شغل سہانا ہو جاتا۔ بار بار گھبرا کر بار بار ہر طرف دیکھتا ہوں اور جب کوئی ہم زبان و ہم سخن دور دور تک نظر نہیں آتا تو چیخ اٹھتا ہوں کہ اے میرے اللہ بھیج دے معقول آدمیوں کو اگر تیرے خزانے میں کوئی معقول آدمی نہیں ہے تو بھیج دے کسی گنگوہ شریف کے مولانا عبدالقدوس ہی کو۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

اللہ اکبر میری شاموں کی ڈائن تنہائی اندھی، لولی لنگڑی اور بسورتی تنہائی اس گاڑھی دبیز گھن گرج گھنگور، گھپ اور گھور تنہائی سے جب میری سانس رکنے لگتی ہے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر چلاتا ہوں کہ

بُلا لائے ناصح ہی کو آج کوئی
اکیلے شب غم میں گھبرا رہے ہیں

جب بڑھاپے کی دھند آدمی کے چاروں طرف پھیل جائے۔ کچھ دکھائی نہ دے آدمی قدم قدم پر ٹھوکریں کھائے۔ بے بسی بے چارگی اور تنہائی کی مکڑیاں دل و دماغ میں جالے بن دیں۔ تو ماضی کی راکھ کریدنے سے ہی کچھ چنگاریاں جگنو بن کر راستہ دکھاتی ہیں۔ اور آدمی چند قدم راستہ چلنے کے قابل ہوتا ہے۔ پرانی یادوں کی ہڈیاں دھودھلا کر اسلاب کی رسی پر ٹانکنے کے دو فائدے ہیں ایک تو آدمی کی اکھڑی سانسوں کو آکسیجن مل جاتی ہے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جوان نسل کے سامنے بوڑھا آدمی اپنی پرانی کارکردگی کی سرکاراما (Cirkarama) دکھا کر محفل میں سینہ تان کر بیٹھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جوش صاحب کے پیش نظر شاید یہی دو فوائد تھے اور انہوں نے یادوں کی برات' لکھ ڈالی۔ یادوں کی برات میرے نزدیک گم شدہ جنت اور اپنی (Roots) کی طرف واپسی کا سفر ہے۔ اس سفر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ اس جزیرے میں بسنے والوں کی روداد ہے ان لوگوں کی کہانیاں ہیں ان لوگوں کے شب و روز کی داستان ہے جو سب جوش صاحب کے اپنے ہیں دادا، پردادا، ماں باپ بھائی بہن رشتے دار نوکر نوکرانیاں اور ملیح آباد ان سب کو یاد کرتے ہوئے جوش صاحب نے زبان کی ایسی کاریگری

اور (CRAFTING) دکھائی ہے کہ سماعت کی گلیوں میں پازیبیں چھنکنے لگتی ہیں اور نگاہوں میں لفظوں کے طوطے مینا پھڑ پھڑانے لگتے ہیں ملیح آباد کی صبح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'......چھت پر گیا تو نسیم صبح میری رضائی میں آکر مچلنے لگی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے سردی زیادہ تھی نہ کم ایک طرب انگیز جھرجھری سے غنچہ خاطر چٹک گیا۔ دل میں وہ راگنی چھڑ گئی جس کو انسانوں کے گلے یا ساز کے تار گرفت میں نہیں لا سکتے۔ دھندلکے نے اپنے گھونگٹ کے پٹ کھول دیئے۔ آسمان نے زمین پر موتی رول دیے تارے کانپ کانپ کر بجلائے جارہے تھے۔ افق کے ملگجے پردوں کے پیچھے ایک نیم دائرہ نور گھوم رہا ہے اور اس کے گرد ایک سنہرا سا ہالہ بنتا جارہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد پھر یہ دیکھا کہ مشرق کا گریبان مسکنے لگا اور مسکتے مسکتے چر سے پٹ گیا''۔

ذرا سا آگے چل کر موسم گرما کے بارے میں جھنجھلا کر کہتے ہیں 'اس کے چمار موسم میں جب حرام زادی لو کے جکڑ غاؤں غاؤں اور ہو ہو ہو کرتے چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساتھ میں جہنم کے گنڈے فرشتے آتشیں گرز سا مار کر زمین کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہیں'۔ اور جب موسم سرما کا ذکر نکلا تو خوشی سے بولے آہا جاڑا۔ شرینی گلابی جاڑا کندن سی دہکتی آنکھٹیوں کا گلزار رضائیوں میں لپٹا ہوا دلدار دل کا سرور آنکھوں کا نور دھندلکے کا راگ چھٹپٹے کا سہاگ زلیخا کا خواب یوسف کا شباب صبح کو سونے کا جال رات کو چاندی کا تھال...... گھبرو لچکیلا بانکا ترچھا نکیلا رسیلا چھبیلا سجیلا سانولا سلونا اور سہانا جاڑا۔

زبان و بیان اور CRAFT کی یہ خوبی بوڑھاپے تک جوش صاحب کے گھر کی لونڈی رہی سب لوگ چھوڑ کر چلے گئے مگر اس نے قلم اور زبان کا ساتھ نہ چھوڑا ذکر ملیح آباد کی حویلی کا ہو محرم یا رمضان کا چچا کا ذکر ہو یا مشاعرے کا احوال کسی مجرے کا نقشہ کھینچیں یا اپنی بادہ نوشی کے آغاز کا قصہ یہ لونڈی ہر پل ساتھ رہی مہابیر سنگھ نے گھر دیپ سنگھ اور سردار تارا چرن نے مل کر جوش صاحب کو کس طرح شراب کی طرف راغب کیا اور ایک طوائف نے یہ کام کیسے سرانجام دیا۔ اسکی

تفصیل دیکھیے 'اف' وہ سولہ سترہ برس کا سن وہ مرادوں کی راتیں مرادوں کے دن، وہ چھلاسی کمر، وہ صراحی دار گردن وہ کسمساتا تیرا بدن۔ وہ سینے کا ابھار، وہ ریشمی پلو کی سطح ناہموار اور جھل جھل کرتی چست انگیا کی کٹوریوں میں وہ زیرِ تعمیر تاج محل کی ہمکار۔ ارے دہائی گنبہِ گردوں کے پروردگار۔ اس کو دیکھ کر زلزلہ آ گیا میرے دیار وجود میں۔

اور پھر جوش صاحب کی ساری پرہیز گاری دھری کی دھری رہ گئی۔ 'میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اللہ کا نعرہ لگا کر ایک سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

یادوں کی برات کا یہ حصہ ۱۸۹۶ سے لے کر ۱۹۴۵ء کے عہد کا بائی سکوپ ہے۔ جادو کا وہ ڈبہ ہے جس کے چھوٹے چھوٹے جھرونکوں سے وہ عہد چلتا پھرتا نظر آتا ہے جس میں جوش صاحب نے بچپن لڑکپن اور جوانی کے موسم گزارے۔ جوش صاحب کے اسلوب اور مزاج نے سچ ثابت کر دیا ہے کہ

Style reflects the tone and temper of that period in which certain has lived.

اپنی یادوں کو حوالہ بنا کر مصنف نے بھر پور سبھا جمائی ہے اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کا چہرہ خصائل، عادات، خامیوں، خوبیوں کو اپنے اسلوب کا حاشیہ لگا کر بیان کیا ہے۔ اس بیان میں جوش صاحب نے جگہ جگہ اپنے جذبات کے ٹانکے لگائے ہیں جن سے تحریر کا تاثر دوگنا ہو گیا ہے۔ صرف یہی نہیں جب وہ اپنے غلام زادہ ملاحسن بخشتا ہے۔ یا باورچن ظہورن یا مالی مرار جی کا ذکر کرتے ہیں تو قلم کے خلوص میں کمی نہیں آتی۔ اس حصے میں موسموں کا بیان رسومات تہوار پہناوے، رہن سہن اور کھانے پینے کی اشیاء کے ذکر نے یادوں کی برات کو اس عہد کی دستاویز بنا دیا ہے۔ بچپن میں ناشتے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''میرے بچپن تک میرے گھر میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ ناشتے میں ہم نہایت خستہ روغنی روٹیاں بالائی اور انڈے کھاتے اور شہد آمیز دودھ پیا کرتے تھے اور جاڑوں کے زمانے میں ناشتے کے بعد ہماری جیبوں میں

چھلے چلغوزے، اخروٹ کی گری کشمش، باداموں کا مغز اور صاف کئے
ہوئے پستے بھر دیئے جاتے تھے۔''

بیان بے جان چیزوں کا ہو یا جانوروں اور انسانوں کا اپنے کمرے کی تصویر کھینچیں یا ذکر پرنس عالم گیر قدر کا جوش صاحب کا قلم جولانیاں دکھاتا رہتا ہے۔ آیئے ذرا جوش صاحب کا کمرہ دیکھئے۔

''میرے خاصے چوڑے لیکن چوڑے سے زیادہ لانبے کمرے میں ایک طرف تو تختوں کا چر کا تھا۔ چر کے پر گدا گدے پر سفید چاندنی، چاندنی پر زریں قالین، مخمل کے گاؤ تکئے۔ سنگ مرمر کا فرش دائیں بائیں سیاہ پالش اور سنہری دھاریوں کی پتلی پتلی کرسیاں کرسیوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی میزیں میزوں پر گلدان، ادھر ادھر چاندی کے اگال دان پختہ فرش پر سرخ دری۔ ایک اونچے میز پر گراموفون دوسرے پر آگرے کے سنگ تراشوں کا بنایا ہوا تاج محل لکھنے کی میز پر بلوریں قلم ایک خوبصورت لیمپ۔ الماری میں شعراء کے دیوان یہ تھی میرے کمرے کی سجاوٹ۔''

اب ذرا پرنس میرزا عالم گیر قدر کے بارے میں سنئے خاندانِ تیمور کی یادگار لکھنؤ کے باشندہ باوقار کچھ اوپر چالیس کی عمر پھر بھی آواز بلا کی پاٹ دار۔ زود اشتعال و شرارہ باز۔ میرے لڑکپن کے یار موسیقی و مزامیر کے ماہر اسرار۔ کھانا پکانے میں یکتائے روز گار سخن سنجوں کے شہر یار اور معلومات عامہ کے پروردگار۔

کتاب کے اس حصے میں کم وبیش یہی انداز برتا گیا ہے اور یہی زبان استعمال کی گئی ہے۔ دکن کے ملا وجہی اور لکھنؤ کے رجب علی بیگ سرور سے جوش صاحب کی بڑی گہری یاری معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ یادوں کی برات لکھ رہے تھے شاید دونوں ان کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ دونوں کے مشورے پر جوش صاحب نے مرصّع اور مقفّع زبان کی کنکریاں قاری کی راہ میں بچھا کر قاری کے لئے بہت سی دشوریاں پیدا کر دی ہیں۔ اگر جوش صاحب دونوں سے کنی کترا کر

چلتے تو یقیناً انکی نثر جان تھن سوئفٹ کے پائے کی نثر ہوتی جس کے بارے میں ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا۔

'سوئفٹ بڑا چالاک لکھاری ہے۔ حرام زادہ تشبیہ استعارے کا کبھی خطرہ مول نہیں لیتا۔''

مگر جوش صاحب نثر لکھتے وقت فقرے کی پشت پر اپنی زبان دانی کا اتنا بوجھ لاد دیتے ہیں کہ اس بات کا دم رکنے لگتا ہے۔ جو وہ قاری سے کہنا چاہتے ہیں۔

میں جب یادوں کی برات پڑھ رہا تھا تو مجھے بار بار ناصر کاظمی مرحوم کا یہ جملہ یاد آرہا تھا کہ جوش صاحب چڑیاں کا شکار کھیلنے بھی ہاتھی پر بیٹھ کر جاتے ہیں۔

لیکن چڑیا کا شکار وہ ہمیشہ ہاتھی پر بیٹھ کر نہیں کھیلتے کبھی ہاتھی ملا وجہی اور رجب علی بیگ سرور کے پاس چھور کر شکار کھیلنے اکیلے بھی چلے جاتے ہیں اور شیر کا شکار کر کے واپس لوٹتے ہیں۔ کراچی شہر کے بارے میں جوش صاحب کی رائے دیکھئے۔

جناب والا کراچی۔ فریب کوشی احباب فراموشی کی عفونت انگیز غلاظت میں ڈوبا ہوا ایسا نامراد شہر ہے جس کی ہوا کھا کر اور جس کا پانی پی کر زیادہ سے زیادہ چار پانچ برس کے اندر اولیاء لفنگنے سالک شیطان اور دیوتا راکشش بن جایا کرتے ہیں۔

وحید الدین سلیم کے بارے میں جملے دیکھئے۔ ان کے رخساروں پر ایسی بے آبرو کر دینے والی داڑھی لٹکی ہوئی تھی کہ جب نگاہ انکی جانب اٹھتی تھی تو ہزاروں گدھ دیکھنے والوں کے پپوٹوں پر آبیٹھتے اور بیٹ کرنے لگتے جس کے بوجھ سے آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔

اس کتاب میں اس قبیل کے سینکڑوں جملے آپ کو ایسے ملیں گے جن پر آپ داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

عزیزوں اور رشتے داروں کے علاوہ جوش نے اپنے دوستوں کے بارے میں بھی لکھا ہے جن میں حکمراں وزراء، افسران اور سیاسی لوگ شامل ہیں۔ انداز وہی دبنگ بے ساختہ تیکھا اور دلچسپ۔ کسی کو وہ آنکھوں میں بٹھاتے ہیں دل میں جگہ دیتے ہیں کسی کو آنکھیں دکھاتے ہیں ٹانگ

کھینچتے ہیں ۔ جوش صاحب کے نزدیک اچھا وہی ہے جو مصیبت میں ان کے کام آیا۔ انکی مدد کی ان کے طلوع ہونے کا اہتمام کیا۔ ہر وہ آدمی جس نے مشکل میں انکی مدد نہیں کی انکی ہاں میں ہاں نہیں ملائی گفتگو میں تلفظ خیال نہیں کیا۔ زیر زبر کی پابندی نہیں کی ان کے نزدیک اچھا آدمی نہیں ۔ کتاب پڑھ کر یہی تاثر ملتا ہے۔

کتاب کے آخر میں وہ حصہ شامل ہے جو بہت سے لوگوں کے نزدیک انکی شہرت اور مقبولیت کا سبب بنا۔ اس حصے میں ان کے ۱۸ عشق شامل ہیں جس کا اظہار جوش صاحب نے فخر سے کیا ہے جوش صاحب جوانی میں بہت دل پھینک غیر ذمہ دار اور بے ایمان عاشق رہے ہیں ۔ جس خوبصورت چہرے پر نظر پڑی دل دے بیٹھے ۔ بیوی کی سہیلی تک کو نہیں چھوڑا۔ ایک محبوبہ ساتھ ہے دوسری کو فون کر رہے ہیں ۔ ایک کو اپنی محبت کا یقین دلا رہے ہیں دوسری کو چٹ پر لکھ کر ملاقات کا وقت تعین کر رہے ہیں ۔ محبوبہ کو لے کر ہسپتال گئے اسے وارڈ میں داخل کرایا اور خود نرس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلے گئے ۔ صبح نہا دھو کر اٹھے اور پہلی کے ساتھ ناشتہ کیا۔ یہ سب روداد انہوں نے اس حصے میں لکھی ہے ۔

ڈاکٹر جانسن کی بائیوگرافی ڈاکٹر باسول نے لکھی ہے ۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے تا کہ انکی زندگی کا ایک ایک پل ریکارڈ پر لا سکیں ۔ ایک بار دونوں رات گئے کسی دعوت سے گھر واپس آرہے تھے لندن میں شدید برف باری ہو رہی تھی ۔ راستے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک دوشیزہ بے ہوش پڑی ہے ۔ دونوں اسے اٹھا کر گھر لے گئے جب کسی طرح اس کے ٹھنڈے جسم میں حرارت نہ آئی تو ڈاکٹر جانسن کپڑے اتار کر اس کے ساتھ لیٹ گئے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور اپنی حرارت اس کے بدن میں منتقل کرنے لگے ۔ صبح ناشتے کی میز پر ڈاکٹر باسول نے ڈاکٹر جانسن سے پوچھا

Should I write in book what happened last night?

جانسن نے مسکرا کر جواب دیا۔

"No when the story is bitter. It is better not to be told."

لیکن جوش صاحب نے بڑی جرأت دکھائی ساری تلخ باتیں (ج۔س) ع۔ق اور ب ج کے عنوانات بنا کر مزے لے لے کر لکھ دیا۔ عشق محبت بڑے شاعروں اور فنکاروں کا من پسند کھاجا ہے۔ لیکن عیب کرنے کو بھی ہنر چاہئے جوش صاحب نے ۱۸ عشق کیئے فرانس کے روسو نے ۵۲ عشق کیئے جو سب کے سب اس کی داستان حیات اعترافات (CONFESSIONS) میں درج ہیں بس جوش صاحب اور روسو میں (MANNERISM) کا فرق ہے۔ روسو سارے جذباتی کارنامے بیان کرتے ہوئے انقلاب فرانس کی تحریک کو نہیں بھولا۔ داستان کے ساتھ ساتھ پس منظر میں تحریک فرانس کا لاوا ابلتا رہتا ہے اس انقلاب کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔ لیکن جوش صاحب اپنے خاندان کے جاہ وجلال، جوانی کی خرمستیوں، ذاتی الجھنوں اور سطحی جذبات میں الجھے رہے اس میں شک نہیں کہ یادوں کی برات اپنے عہد کی تہذیبی جھلکیوں کا ایک خوبصورت البم ہے۔ زبان وبیان دلکش اسلوب مضبوط ڈکشن کا خوبصورت مرقع ہے اردو کے منفرد اور عظیم شاعر کی زندگی کے شب وروز کی داستان ۔ بڑے شاعر کے عروج کی داستان زوال کی دھند میں کھانستے شاعر کی کہانی، دادا پردادا کی شان اور وقار کی کہانی ۔ جوش صاحب کی بادہ نوشی طوائفوں کے مجروں اور جوش صاحب کے عشق کی الف لیلیٰ، جوش صاحب کے جھوٹ سچ کی کہانی ۔کرشن بھگوان نے ارجن کو ۵ بار جھوٹ بولنے کی اجازت دی تھی اور ان پانچ مقامات کی نشان دہی کی تھی لیکن لگتا ہے جوش صاحب نے اس کتاب میں صرف پانچ بار سچ بولا ہے لیکن پھر بھی نثر لکھتے ہوئے اچھے لگتے ہیں ان کے جھوٹ پر بھی سچ کا گمان ہوتا ہے۔

یادوں کی برات ایک دلچسپ مزیدار ایک تہذیبی عہد میں جھانکنے کا خوبصورت دریچہ۔ سردیوں میں آتش دان کے سامنے بیٹھ کر پڑھنے کے لئے یہ کتاب بہترین کتاب ہے لیکن کاش جوش صاب اس کتاب میں اس عہد میں ابھرنے والی سیاسی فکری نظریاتی تحریکوں کا تفصیلی ذکر کرتے جن بڑے لوگوں سے وہ ملے تھے انکی فکری سیاسی وابستگیوں اور تبدیلیوں کی روداد بھی لکھ دیتے صرف فرنگی سے نفرت کا باب لکھ دینے سے کوئی بڑی بات نہیں بنی۔ جوش صاحب خاندانی تعریف وتوصیف اور ذاتی الجھنوں کی روداد لکھتے رہے۔ مجروں اور طوائفوں کے گرد حاشئے لگاتے

رہے اور ایک بڑی کتاب بنتے بنتے رہ گئی۔ اب بھی یادوں کی برات کی ایک ادبی حیثیت ہے ایک ریڈ ایبل کتاب ہے ادبی کتابوں میں اس کا ایک مقام ہے لیکن اگر وہ ان باتوں کی طرف توجہ دیتے جن کی طرف میں نے اشارہ کرنے کی جرأت کی ہے تو یہ کتاب روسو کی (Confessions) کی ہم پلہ ہوتی پھر شاید قارئین کو ان کا ہاتھی پر بیٹھ کر چڑیا کا شکار کھیلنا بھی قبول ہوتا۔

☆☆☆

یادوں کی برات کا تجزیاتی مطالعہ

اشفاق حسین

یوں تو ادھر کچھ دنوں سے اردو میں خودنوشت کا سلسلہ عام ہوگیا ہے۔ مگران میں ذہنی تحفظات سے کام لیا گیا ہے۔ یادوں کی برات دراصل ایک تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں جوش ملیح آبادی نے اپنی افتادطبع کے گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔ فکری اور نظری اعتبار سے اس پر اعتراضات وارد کئے جاسکتے ہیں ان پر دروغ گوئی کا الزام بھی عاید کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے وصف خاص سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک بے باک شاعر کے قلم سے نکلے ہوئے جواہر پارے ہیں۔ جواُن کا جواب تو کیا دنیائے ادب میں اپنی مثال نہیں پیش کرسکتے اور یہ نہ صرف ایک تصنیف ہے بلکہ اپنے ساتھ مصنف کے حادثات وتجربات کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے۔ 'چند ابتدائی باتیں کے باب' میں انہوں نے اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں اپنی مشکلات کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اب ان کے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔ اس لئے اس مسودے کو وہ قطعی طور پر کتابی شکل میں پیش کردینا چاہتے ہیں۔ غور طلب ہے کہ ان کے مطابق ان کا حافظہ ہمیشہ سے کمزور رہا ہے اب اس میں اوراضافہ ہوگیا ہے۔ ان کی زندگی کے چار بنیادی میلانات اس طرح ہیں۔ (۱) شعرگوئی (۲) عشق بازی (۳) علم طلبی اور (۴) انسان دوستی۔ ان کے نزدیک شاعری کا ملکہ خداداد ہے۔ اس لئے اس میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے۔ عشق بازی کی بدولت اور ماہ رخوں کی کشش نے ان کے قلب وذہن کو روشن کردیا اور شاعری کی کج

کلا ہی ان ہی کی عطا کردہ ہے۔ 'میں نے کوے بتاں میں جس قدر بھی اپنی دولت، صحت، جوانی اور زندگی مٹھیاں بھر بھر کر لٹائی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ذہنی کمائی کما چکا ہوں اور مکھڑوں کے خدوخال چن چن کر میں نے اپنے گردوپیش اس 'قدر عظیم سرمایہ جمع کرلیا ہے۔ جسے آج تک گھر بیٹھے کمار ہا ہوں اور مرتے دم تک کھاتا رہوں گا۔ ان کو طلب علم کا شوق بچپن سے تھا۔ اس لئے انہوں نے روایتی طور پر گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کے بجائے باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دی۔ فرماتے ہیں،

> ''اگر میرے دل میں علم کی لگن نہ ہوتی تو دیگر رئیس زادوں کی طرح جاہل رہ جاتا۔ میں نے بچپن میں کوئی کھیل نہیں کھیلا اور ہوش آتے ہی، کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔''

ان کو مذہب سے کوئی شغف نہ ہونے کی وجہ سے بغاوت کرنی پڑی اور والد کو ناراض کرنا پڑا دل میں جوانی آتے ہی دین سے بغاوت کا میلان پیدا ہو گیا تھا اور میرے راسخ العقیدہ باپ تک جب یہ خبر پہنچی تھی کہ میں بعض مسلمات کا مذاق اڑاتا ہوں تو انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر فرمایا تھا کہ مجھے اس کا خوف پہلے ہو گیا ہے کہ تو آگے چل کر گمراہ ہو جائے گا۔ اللہ کا لاکھ شکر کہ میرے باپ کا خیال درست نکلا اور میں گمراہ ہو گیا۔''

حصول علم کی خاطر انہوں نے دوسرے غیر مسلم آستانوں کا بھی چکر لگایا۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا مگر کسی بات سے تشفی نہ ہوئی۔ صوفیوں اور فقیروں کے یہاں بھی حاضری دی، مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور تجسس اس قدر بڑھ گیا کہ آخر عمر تک قائم رہا۔ علم کا قلعہ فتح کرنے کے بعد بھی خود کو جاہل محسوس کرتے رہے۔ ان کے یہاں انسان دوستی کا جذبہ قوی ہے۔ فرماتے ہیں ہاں انسان کرہ ارض کی جان انسانی دشمنی عظیم عصر اون جب انسانی عین ایمان انسان کا چہرہ گیتا اور قرآن مظلوم سے ہمدردی اس قدر ہے کہ جب تک مظلوم اپنے ظالم کو معاف نہیں کرے گا اس کو بخشش نہ ہوگی اس ضمن میں عشق اور حب کے درمیان فرق اس طرح واضح کرتے ہیں 'عشق کا تعلق' صرف ایک ذات معشوق سے ہوتا ہے اور حب کا تعلق کروڑوں انسانوں سے ہوتا ہے۔

جب یہ فرق ذہن نشین ہو گیا تو غم جاناں سے غم دوراں کی طرف چل پڑے اور انسانوں کے مصائب کو اپنے جگر کا درد بنالیا۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ان کے نزدیک انسانوں کے درمیان نفرت وعداوت کی ایک اور وجہ مفاد پرست سیاست داں ہیں وہ اپنی ہوس کی تکمیل کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ کبھی امریکہ امن پسند ویت نامیوں پر حملہ کرتا ہے اور اس طرح ان کو محکوم بنانا چاہتا ہے۔ حاکم ومحکوم کی شکل میں یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام بدترین قسم کا ہے۔ اس میں مہر ووفا کا گزر نہیں۔ اس نظام کو دیکھ کر چنگیز، ہلاکو، ابن زیاد اور یزید کو بھی شرم آجائے گی۔ امیروں اور غریبوں کے درمیان اس قدر فرق ہے کہ پہلا طبقہ عمدہ قسم کے کھانے کھاتا ہے تو دوسرا طبقہ روکھا سوکھا کھانا کھاتا ہے۔ جب وہ ریشمی لحاف میں سوتے ہیں تو فٹ پاتھ پر سونے والے لاکھوں انسانوں کو بغیر چادر کے جاڑوں میں سونا پڑتا ہے۔ دولت کمانے کی ان کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے مگر ان کو سکون نصیب نہیں ہوتا اور راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ ان برائیوں کا خاتمہ صرف سوشلزم سے ہوسکتا ہے۔ مصنف کے نزدیک طبقاتی کشمکش اور سوشلزم کا نظریہ خیالی نہ ہو کر سائنٹفک ہے ۔ظالم ومظلوم کے درمیان جنگ جاری ہے ایک طرف ظالم مفاد کی خاطر مظلوم کا استحصال اس حد تک کرتا ہے کہ عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بناتا ہے۔ جب غریب عوام کو بیماری قحط اور فاقہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس موقع کا فائدہ اٹھا کر وہ ظالم اپنی تجوریاں بھرتا ہے۔ مصنف اپنی ولادت کے متعلق کوئی تاریخ نہیں بتاتے۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۸ء میں سے کوئی سال ہوسکتا ہے۔ وہ جب جائے پیدائش ملیح آباد کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے ساتھ پوری کائنات لے کر چلتے ہیں۔ اس سے وہاں کی آب وہوا اور فضا وماحول کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ان سب سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ ادنی اور اعلیٰ دونوں طبقوں کی تہذیبی وثقافتی زندگی کا علم ہوتا ہے۔ ملیح آباد کے کونے میں آفریدی پٹھان آباد ہیں۔ یہ درۂ خیبر سے آئے تھے تو دوسری طرف قندھار سے

آئے ہوئے قندھاری لکھنوی تہذیب سے الگ دونوں قبیلوں کے درمیان قبائلی جنگ چلتی رہی مگر آگے چل کر لکھنؤ کی تہذیب کا ان کی تہذیب پر ایسا غلبہ ہوا کہ ان کے یہاں انقلاب برپا ہوگیا۔ ان لوگوں نے بہت ساری پرانی باتوں کو بھول کر نئی باتوں کو اپنالیا۔ ان نئی باتوں میں تیل وعطر کا استعمال، قباولباس میں تبدیلی، مرغ بازیاں، بٹیر بازیاں اوران کی پالیاں وغیرہ ہیں۔ السلام علیکم کے بجائے آداب، تسلیمات، کورنش اور بندگی جیسے الفاظ کا استعمال ہونے لگا۔ دونوں قبیلوں کے مابین عداوت اس قدر تھی کہ حقہ پینے کی آواز اور تھوکنے تک کو بہانہ بنا کر جوتم پیزار ہو جاتے اور لاٹھیاں چلنے لگتی تھیں۔ ان کی انفرادی تہذیب وتمدن ایک عرصے تک ہنوز باقی رہی۔ حویلی کی اندرونی حالت بھی قابل رشک تھی۔ لونڈیاں باندیاں اور کنیزوں اور ملازموں کی چہل پہل اور بیرون کوٹھی میں نوکروں وملازموں کی سرگرمیاں رہتی تھیں۔ مہمانوں کا آنا ان کے جانے کے بعد دوسرے مہمانوں کا آنا وہاں ایک خاص بات تھی۔ گھر میں والد کا رعب ودبدبہ رہتا۔ شیر خاں کے گھر جانے پر ان کو سزا ملتی۔ اسکے علاوہ مصنف نے آپنے بچپن کے تیور، غصہ، اور ذہنی رو کہنے کو یہ ساری باتیں مصنف کی ذات سے وابستہ ہیں مگر اس دور کے جاگیردارانہ نظام کی عکاسی کرتے ہیں۔ حقیقت وصداقت کا سہارا لے کر انہوں نے کھیل کود اور توہمات کا ذکر کیا ہے اور اپنی بسم اللہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب ان کی بسم اللہ ہوئی تھی تو چاندی کی تھالی میں سونے کی دوات سونے کے خول کا قلم اور قرآن ان کے سامنے رکھا گیا تھا۔ ان کے اولین مولوی نیاز علی خاں نے بسم اللہ کرائی تھی۔ اس کے بعد حاضرین کے گلوں میں ہار ڈالے گئے تھے۔ مٹھائی تقسیم کی گئی تھی۔ اور جشن بھی منایا گیا تھا۔ ان کے اساتذہ ہر زبان کے الگ الگ تھے۔ فارسی کے معلم مولوی نیاز علی خاں، اردو کے معلم مولانا طاہر اور عربی کے معلم مولوی قدرت اللہ اور انگریزی کے معلم ماسٹر گومتی پرساد تھے۔ وہ گاؤں کا پہلا نظارہ بیان کرتے ہیں تو اُن کی خیالاتی اور رومانی کیفیات موجزن دکھائی دیتی ہے۔ اس نظارے نے ان کے شعور میں ہلچل پیدا کر دیا تھا۔ وہاں کے نظاروں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آخر حد تک نہ بھلا سکے۔ انہوں نے اپنی بعض نظموں میں ان کیفیات ومحسوسات کو سمویا ہے۔ تاحد نظر جھومتے لہلہاتے وگنگناتے کھیت کھیتوں میں دھرتی ماتا کی

اگی ہوئی تمنائیں اور مستجاب دعائیں۔ بیچ بیچ میں مانند زلف بتاں پیچ وخم کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں، جھیل کی خوبصورتی کھیتوں میں دور کچے کچے لیپے پتے مکانوں کے چھپر اونچے اونچے کھلیان نکائی کرنے والی جوان جوان عورتیں الڑھ چھوکریاں۔ ادھر طوفان ادھر اٹھان۔ ان کے لال پیلے لہنگے اودی اودی چندریاں۔ شاداب چہرے اور گٹھے گٹھے بدن۔ پتلی کی چھلکتی چھلکتی گاگروں کے نیچے صراحی دار گردنوں اور پتلی پتلی ان کی کمروں کی لچک دیکھتے ہوئے وہ تعلقہ داروں اور جاگیر دارو ں کی قیام گاہ تک پہنچ گئے۔ رعایا نے ان کا نذرانہ اتارا اور ڈھیرے ڈھیرے تخت پر سکّوں کا انبار لگ گیا۔ یہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک کاشتکار نے مجبوری کی حالت میں آدھا لگان دینا چاہا تو ان کے پھوپھا نے اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا۔ اس کی پٹائی سے ان کا دل دہل گیا۔ ان پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ والد کے سرہانے زار قطار رونے لگے۔ وجہ معلوم ہونے پر ان کے والد کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ آخر کار کاشتکار کا عذر مان لیا گیا۔ موسموں کے تاثرات نے ان کی رومانی کیفیت کو بیدار کیا ہے۔ ان کے زمانے کے تہوار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موسم گرما میں لو کے تھپیڑوں اس سے پیدا کردہ تکلیفوں اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے خاص خانے کا استعمال اور روز کے معمولات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ موسم سرما کا استقبال اور برسات کے موسم میں کھانے پینے کی خاص خاص چیزیں۔ جھولا جھولنا اور کجریاں سننا۔ ہولی کا تہوار پورے اہتمام سے منایا جاتا۔ ہندو اور مسلم دونوں مل کر ان تہوار کو مناتے۔ نذرانہ کھانوں اور مٹھائیوں کی صورت میں دیا جاتا۔ ان کی دعوت ہوتی تھی۔ رات بھر طوائفیں ناچتی تھی اور مجرا سناتی تھیں۔ شب برات تہوار آتش بازی لذیز کھانوں اور نذر و نیاز کے ساتھ حویلی میں منایا جاتا۔ رمضان کے مہینے میں ہر دن افطار کا اہتمام کیا جاتا۔ اعزا و اقارب اور ملازمین سب مل کر روزہ کھولتے۔ ان میں اکثریت روزہ خوروں کی ہوتی۔ عید کا تہوار بے شمار خوشیاں لے کر آتا۔ بیبیاں چاند دیکھتی تھیں اور دعا کرتی تھیں۔ عید مبارک کی گونج پورے ماحول میں سنائی دیتی تھی۔ مردانے میں گولے چھوٹے اور بندوقیں دغنے لگتی تھیں۔ بچے خاص طور سے خوشیاں مناتے۔ قربانی سے بقر عید کا تہوار منایا جاتا۔ بے کس و معصوم بکروں یہاں تک کہ میمنوں،

دنبوں اور بچھڑوں کی قربانی دی جاتی ۔قربانی کی یاد تک سے مصنف کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ۔ چونکہ دادی شیعہ تھیں اس لئے امام باڑے میں مجلس کرتی تھیں ۔ ماتم کیا جاتا اور سینہ زنی کی جاتی ۔ وہ ملیح آباد سے لکھنؤ پہلی مرتبہ ریل گاڑی سے آئے تھے ۔ریل گاڑی کا انتظار کرنا اسٹیشن کا مجمع اور اسٹیشن کے باہر پہلی مرتبہ شراب کا اشتہار دیکھنا یہ ساری باتیں خاص طور سے قابل توجہ ہیں ۔ان باتوں کے علاوہ بدشگونی کے باعث ان کا صدقہ اتارا گیا۔ چوک محلہ کا منظر جس میں طوائفوں کی دلکش ادائیں ۔مختلف عمر اور رنگ کی ہوتے ہوئے بھی ان کی دلکشی میں کوئی کمی نہ تھی ۔لکھنؤ کے کھانوں کا کوئی جواب نہیں ۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے ۔ ان میں قابل ذکر ملائم اور لذیز مچھلیاں اور مختلف دکانوں کے کھانوں کا کہنا کیا۔ ہر کھانے کا لطف اور اس کا ذائقہ الگ ہے ۔ مٹھائیوں کا لطف کچھ اور ہی ہے ۔ مقامات میں حسین آباد کی شاہی کوٹھی اور اسکا کلاک ٹاور حسین آباد کا امام باڑہ اسکی بھول بھلیاں ۔آصف الدولہ کا امام باڑہ رومی دروازہ ،حضرت عباس کی درگاہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔لکھنؤ کے روساء علماء ،ادیبوں ،شرفاء ،اور شعراء جوان کے والد سے ملاقات کے لئے آتے تھے یا ان کے والد خود جن کے یہاں تشریف لے جاتے تھے ان کے لچکیلے سلام ۔ان کی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز ان کی تہذیب میں ڈوبی ہوئی وضع قطع ان کے لباس کی تراش خراش ۔ مسائل علمی ،ادبی توضیح کا ہنگام ۔ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ ۔ان کے لہجوں کا کٹاؤ غزل پڑھتے وقت شعراء کے چہروں کا انوکھا اتار چڑھاؤ قہقہوں کے بجائے تبسم ہاتھ جوڑ کر ہیچمدانی کا اعتراف ۔ وہ تمام لوگ اس قدر شائستہ شستہ اور گداختہ تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کرۂ خاک کے نہیں کسی کوہ تور کے باشندے ہیں ۔انہیں کی جوتیاں سیدھی کر کے میں نے شائستگی سیکھی ۔ادب اور زبان میں نظر پیدا کی اور یہ ذرا سی شُد بد جو آج مجھے ادب اور زبان پر حاصل ہے یہ انہیں کی صحبت کا اثر ہے جب آج کے لکھنؤ سے مقابلہ کرتے ہیں تو وہ ماتم کرتے ہیں ۔

مصنف کی زندگی میں خوشی کا دن وہ تھا جب ان کے والد نے کسی طرح ان کو پڑھائی کے لئے سیتاپور جانے کی اجازت دی ۔اس خوشی کو وہ تاعمر محسوس کرتے رہے مگر والد کی والہانہ محبت نے ان کو گھر واپس بلالیا۔ ان کو لکھنؤ کے ایک اسکول حسین آباد ہائی اسکول میں داخلہ

دلایا گیا۔ انہوں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا وہ بھی والد سے چھپا کر ان کے والد شعر گوئی سے نفرت کرتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ایک منحوس فن ہے مگر بیٹے کے شوق اور ضد نے اس بندش کو ختم کر دیا۔ اور ان کو شعر گوئی کی اجازت آخر مل ہی گئی۔ ورنہ اردو شاعری ایک عظیم شاعر سے محروم ہو جاتی۔ حقیقتاً کوئی باپ اپنے بیٹے کو شعر گوئی سے نہ روک سکا اور ان کے اندر کے شاعر نے شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے والد کو ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ ان کا بیٹا شاعر بننے کے بعد کسی کام کا نہ رہ جائے گا۔ وراثت میں اسکو جو جائداد ملے گی وہ اسکے گزر بسر کرنے کے لئے ناکافی ہوگی۔

۱۱-۱۹۱۰ء میں ان کا پہلا مشاعرہ تھا۔ اپنے والد کے ساتھ فرنگی محل کے ایک مشاعرہ میں شرکت کی تھی۔ مشاعرہ گاہ اور پورے مشاعرہ کا نقشہ اسکی حقیقی صورت میں کھینچا ہے۔ اس مشاعرہ میں انہوں نے خوب داد تحسین حاصل کی تھی۔ مرزا ہادی رسوا نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کے، ایم.اے.او. کالج میں داخلہ لیا۔ ہاسٹل، طالب علموں اور اساتذہ کا ذکر اس تفصیل سے کیا ہے کہ اس وقت کا ماحول اور فضا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ علی گڑھ کی سالانہ نمائش کی تصویر کشی اسکی حقیقی صورت میں کی ہے۔ علی گڑھ سے نکل کر وہ دوبارہ لکھنؤ آگئے تھے۔ یہاں جوبلی ہائی اسکول میں داخلہ لیا اسکے بعد چرچ گیٹ اسکول چرچ مشن ریڈ کرسچین کالجیڈیٹ اسکول میں ایک کے بعد ایک اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کی ملاقات پرانے دوستوں سے ہوئی اور شیعیت کی طرف مائل ہوئے۔ یہاں تک کہ والد کے منع کرنے پر بھی تبرائی شیعہ ہونے کا ارادہ کیا اور جشن تبرا میں شرکت کرنے لگے۔ اس کے لئے ان کو موروثی جائداد سے محروم ہونا پڑا۔ والد کے انتقال نے ان کو کمزور کر دیا اور خود کو بے یار و مددگار سمجھنے لگے۔ 'روح ادب' پہلی مرتبہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ ان کا عقد ہوا۔ تقسیم جائداد ہوئی حُبِ وطن کے جذبات نے انگریز کی نوکری قبول نہ کرنے دی۔ روح ادب غالباً میتھوڈسٹ پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ رفیع احمد خاں کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔ اسرائیل احمد خاں اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے تبصرے کئے تھے۔ اعتراض کرنے والوں میں سب سے پہلے مولانا سجاد انصاری تھے۔ اس وقت

مسٹر عبدالماجد مولانا عبدالماجد کی جانب سفر کر رہے تھے اور کفر سے منہ موڑ کر اسلام کی جانب آ چکے تھے۔ سجاد انصاری حلقہ اسلام سے بھاگ کر کفر کی طرف مصنف کے مطابق دونوں حضرات کے مابین معاہدے ہو چکے تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف لکھیں گے۔ اسی زمانے میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبال نے بھی ایک طویل خط لکھ کر میری شاعری کی مدح سرائی فرمائی اور دل کھول کر داد دی تھی۔ اپنے عنفوان شباب تک کہ ہندوستان کے متعلق یہاں کی تہذیبی ومعاشرتی حالات کا جائزہ لیا ہے اور تقابلی مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوستان ایک غلام ملک تھا۔ اس اعتبار اسے وہ دوراہے پر کھڑا تھا۔ وہ یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں میں سے کس کو پسند کر کے اپنا لے۔ ناپسند کر کے خارج کر دے۔ اس کشمکش میں تین طرح کے گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک گروہ خالصتہً مشرقی تہذیب کا دلدادہ تھا تو دوسرا گروہ خالص مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا اور تیسرا گروہ دونوں میں سے آدھا آدھا تھا جو قطعی طور پر طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کس طرف جائے اور کس کو اپنائے۔ اِن تینوں گروہوں میں اکثریت مشرقی تہذیب ماننے والوں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ عدم تحفظ کا احساس بھی تھا۔ مصنف نے ان کے وضع قطع لباس وعادت اور روزمرہ کی زندگی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ خالص مشرقی گروہ کے چہروں پر لمبی یا ہلکی داڑھیاں تھیں۔ سروں پر پٹے اور عمامے۔ پاؤں میں مسلم شاہی جوتے پائے جامے شانے پر بڑے بڑے رومال وغیرہ نیم مشرقی گروہ شیروانیاں پہنتا۔ چست پائے جامے اور پمپ جوتے پہنتا اور جیبوں میں گھڑیاں رکھتا تھا۔ مغربی گروہ سوٹ بوٹ سے لیس رہتا اور مونچھے رکھتا تھا۔ مغربی گروہ اقلیت میں تھا۔ اور اسے پلپلی صاحب کہہ کر چڑھایا جاتا۔ اس کے مشاغل اور دلچسپیاں بھی مختلف تھیں۔ ہندوستانی کھیل کود کبڈی اور گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلا جاتا۔ پالکیوں، ڈولیوں اور بند گھوڑا گاڑی وغیرہ کا استعمال ہوتا تو دوسری طرف سواری کے لئے موٹر گاڑی اور سائیکل کا استعمال ہوتا۔ دونوں گروہوں کی شامیں اور راتیں مختلف تھیں۔ ایک طرف جھاڑ فانوس اور شمعیں روشن کئے جاتے۔ عطر دان اور گلوریوں کے لئے مناس ڈبے کھل جاتے۔ ادھر کلبوں میں تاش اور بیڈ منٹن کھیلے جاتے۔ پیانوں اور گراموفون بجائے جاتے۔ مغربی دھنوں پر رقص کئے

جاتے اور گانے گائے جاتے میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا چمچ کانٹے کی مدد سے کھایا جاتا دوسرا گروہ فرش اور چوکی پر بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ انگریزوں کے کلبوں میں ہندوستانیوں کا داخل ہونا ممنوع تھا اس لئے مغرب پرستوں کے کلبوں میں اینگلو انڈین لڑکیاں اور عورتیں شرکت کرتی تھیں۔ دونوں گروہوں کے کھانوں کی فہرست اس طرح ہے۔ پہلا گروہ مختلف قسم کے کباب، قورمہ، پلاؤ بریانی اور گوشت سے تیار کئے گئے متعدد قسم کے کھانے کھاتا اور کئی قسم کی روٹیاں اور چپاتیاں کھاتا۔ حلوے اور مٹھائیاں کھائی جاتی تھیں تو دوسری طرف سوپ کٹلٹ، چاپ، ابلی مچھلی وغیرہ اور ترکاریاں بھی ابلی کھائی جاتی تھیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مغرب زدہ لوگوں کی عورتیں خالص مشرقی طرز کی ہوتی تھیں ان سب کی ایک لمبی فہرست ہے۔ وہ پردے کی پابند تھیں۔ دولکی اور پالکی کے بغیر گھر سے باہر قدم نہ رکھتی تھیں۔ دس بارہ سال کی عمر سے لڑکوں کا زنان خانے میں جانا منع تھا۔ آواز کا بھی پردہ ہوتا تھا۔ لمبی لمبی ترکاریوں کو ٹکڑوں کی شکل میں زنان خانے میں بھیجا جاتا تھا کیونکہ ان ترکاریوں کو فحش ترکاری کہا جاتا تھا۔ اگر کوئی عورت ناچ و مجرے کے وقت جھانک بھی لیتی تھی تو اسکو گولی ماردی جاتی تھی۔

سیاسی اعتبار سے اس وقت ملک بیدار نہیں ہوا تھا تلک اور گوکھلے کی آواز پر تھوڑا بہت سیاسی چرچے تھے مگر انگریزوں کے دل و دماغ پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور کسی خطرے سے بےفکر تھے لیکن گاندھی جی کی آمد سے ملک کی سیاست نے ایک نئی کروٹ لے لی۔ اس سے برطانوی حکومت کے ہوش اڑ گئے۔ گاندھی جی کے اثر سے ہندو اور مسلم دونوں فرقے متحد ہو گئے۔ اس سے حکومت کے لئے ایک بڑا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حکومت فکر مند تھی کہ دونوں فرقوں کے درمیان نفرت کا جو بیج بو دیا گیا تھا وہ بیکار کیسے ہو گیا۔ جب کہ اس کام کے لئے لاکھوں روپئے خرچ کئے گئے تھے۔ لہٰذا ان پر نئے نئے ستم ڈھائے گئے۔ دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے دینی رہنماؤں پر لعنت ملامت کی گئی۔ کہ ان لوگوں نے اتحاد کیوں پیدا ہونے دیا۔ ان تمام نوابوں، خان بہادروں زمین داروں، جاگیرداروں، تعلقے داروں اور دوسرے پٹھوں کو حکم دیا گیا کہ وہ کانگریسیوں اور دوسرے آزادی کے شیدائیوں کو کچل کر رکھ دیا جائے چنانچہ ایسا کیا گیا۔ غالباً ۱۹۱۸ء میں سیاست سے ان کی وابستگی

قومی تحریک سے ہوئی۔ محمد مستقیم نے قومی تحریک اور گاندھی جی دونوں سے ان کی واقفیت کرائی تھی۔ احمد آباد جا کر گاندھی جی سے ملاقات بھی کی اور وہاں ان کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ہوئی تھی۔ وہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تھا اور شرکت کی غرض سے وہاں گئے تھے۔ جن دوسرے رہبران قوم سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں مثلاً مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد سجانی، وجے لکشمی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ۔ جلسے میں فرقہ وارانہ اتحاد کا منظر قابل دید تھا۔ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رات کے وقت آل انڈیا خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا تھا۔ اس پنڈال میں گئے تو دیکھا کہ مولانا حسرت موہانی اور گاندھی جی کے درمیان رسہ کشی چل رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی بات پر قائم تھے۔ حسرت موہانی آزادی کامل کی تجویز منظور کرانا چاہتے تھے اور گاندھی جی صرف آزادی کا مطالبہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ ٹیگور کی ملاقات نے ان کی زندگی کو متاثر کیا تھا۔ ٹیگور پہلے ہی جوش کی نظم طلوع صبح کا انگریزی ترجمہ سروجنی نائیڈو کی زبانی سن چکے تھے۔ ٹیگور کی دعوت پر وہ شانتی نکیتن بھی گئے تھے۔ وہاں انہوں نے شاعری کا ایک دوسرا رخ بھی دیکھا اور سمجھا۔ ان کے ایک ہم سفر شاعر بنگلہ زبان کے قاضی نذر الاسلام تھے۔ انکی باغیانہ اور انقلابی شاعری کے چرچے ملک گیر تھے۔ جوش جیسا باخبر اور تعلیم یافتہ شاعر ان کے چرچوں سے ناواقف نہیں ہوسکتا تھا۔ شانتی نکیتن میں بھی ان کی متعلق ضرور سنا ہوگا۔ مگر مصنف نے ان کا کہیں ذکر تک نہیں کیا۔ اس وقت بنگلہ زبان میں دو رویوں کی شاعری ہورہی تھی۔ پہلی شاعری سرد شاعری کہلاتی ہے۔ اس کی نمائندگی ٹیگور کر رہے تھے۔ دوسری شاعری گرم شاعری کہلاتی ہے۔ اسکی نمائندگی قاضی کر رہے تھے۔ اسی طرح اردو میں بھی اقبال و جوش دو مختلف دھارے کی شاعری کر رہے تھے۔ جوش کے کلام میں کہیں کہیں ماضی کے اثرات محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ جوش کے یہاں شدت جذبات کا غلبہ اکثر اس قدر حاوی ہے کہ محسوس ہونے لگتا ہے آزادی کی یہ جنگ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان نہ ہوکر آفریدی اور قندھاری پٹھانوں کے بیچ چل رہی ہے۔ انہوں نے غم روزگار کا ذکر پر اثر طریقہ سے کیا ہے۔ اس کے لئے وہ حیدر آباد گئے تھے۔ وہاں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی تصویر کشی خوب کی ہے۔ وہاں کا سفر ان کو راس نہ آیا اور

دربدری کے عالم میں دتیا پہنچ گئے۔ چونکہ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور کسی طرح سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہاں پر بھی کامیاب نہ ہو سکے اور دھول پور میں بھی یہی صورت رہی۔

اپنی صحافتی زندگی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ دہلی میں کلیم رسالہ سے کیا۔ سروجنی نائڈو کی فرمائش پر انہوں نے ایسا کیا مگر تجربے کی اور مزاج کی ناہمواری کی وجہ سے ساڑھے تین چار سال تک نکل کر یہ رسالہ بند ہو گیا۔ وہ اس ناکامی کی ایک وجہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے سر تیج بہادر کا مشورہ نہ مانا تھا۔ مشورہ یہ تھا کہ وہ انگریزوں سے نفرت نہ کریں اور سوشلزم کی باتیں نہ کریں۔ اس طرح وہ لاکھوں روپۓ کما سکتے تھے اس کے برخلاف دوسری عالمی جنگ کے موقع پر انہوں نے ایک نظم ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب کہی تھی اس جارحانہ نظم نے انگریزوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ اور ان کے منصوبوں کو دھکا لگا تھا۔ حسین اور انقلاب مرثیہ نے بھی انگریزوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ پہلی نظم کو سرکار انگلشیہ نے ضبط کر لیا تھا۔ رسالہ آجکل کی ادارت بھی کچھ عرصے کے لئے کی تھی۔ فکر معاش اور اہل خاندان کے مستقبل کی فکر نے ان کو پاکستان ہجرت کرنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ وہاں ان کے ایک ہمدم دیرینہ سید ابو طالب نقوی تھے۔ وہ کمشنر تھے انہوں نے جوش کے گزر بسر کے لئے کافی کچھ کرنا چاہا تھا مگر خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اس طرح وہاں بھی ان کی زندگی کربناک تھی۔ وہاں ان کے خلاف محاذ آرائی شروع ہو گئی تھی۔ اس لئے خود کو کونے میں حسین کی طرح تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ اسکے وجوہات کئی ہیں۔ ان میں چند خاص اس طرح ہیں مزاج کی تیزی اور خودداری کانگریس اور مسلم لیگ کے شدید جھگڑے نے دو ملکوں ہندوستان اور پاکستان کو جنم دیا تھا۔ دونوں جماعتیں اپنے [illegible] ملک میں برسر اقتدار تھیں [illegible] مصنف کی وابستگی کانگریس سے تھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے [illegible]

[illegible] وہاں ان [illegible] انہوں [illegible]

[illegible] باتوں سے تنگ آکر دوبارہ ہندوستان میں سکونت اختیار کرنا چاہا تھا مگر کافی دیر ہو [illegible] تھی۔ پاکستان میں آخری زندگی اطمینان بخش نہ ہونے کی وجہ سے وہ مایوس ہو گئے تھے۔ کتاب کے آخری چند ابواب میں رشتہ داروں، دوستوں اور عزیزوں کو یاد کر کے تشفی کی ہے۔ اپنے پردادا

دادا، باپ، ماں، چچا، بیوی، بیٹا اور بیٹی کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ ان اسباب کا ذکر کیا ہے جن سے انکی قربت اور رغبت تھی۔ مثلاً ابرار حسن خاں، اثر ملیح آبادی، مختار احمد خاں، قاضی خورشید احمد، حکیم صاحب عالم، رفیع احمد خاں، پرنس مرزا عالم گیر قدر، مولانا سہاب بھوپالی، ڈاکٹر ایس کے سکسینہ، مانی جائسی، مرزا شرر لکھنوی، شاہ دلگیر اکبر آبادی، نواب جعفر علی خاں اثر، حکیم آزاد انصاری، فانی بدایونی، آغا شاعر قزلباش، سردار روپ سنگھ، وصل بگرامی، ڈاکٹر کرنل اشرف الحق، کنور مہندر سنگھ بیدی، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، میاں محمد صادق،، علامہ حیرت، سردار دیوان سنگھ مفتوں، مولانا عبدالسلام، مولانا عبداللہ عمادی، مصطفیٰ زیدی، مجاز، چند عجیب ہستیاں اس طرح ہیں۔ مثلاً سخاوت حسین، ناظم الدین حسن، علی گڑھ کا ایک گمنام پٹھان شاعر، نبی شیر حان، گنجو خاں، امیر احمد خاں، ہدایت اللہ خاں، محبوب شاہ مجذوب، الویرو، شیر احمد خاں رامپوری، مولوی احمد حسن، نواب زادہ حکیم دانش لکھنوی، نواب رستم علی خاں مہر، چھلاؤ خاں ان کے معاشقے بھی کم اہم نہیں ہیں مگر اپنے معشوقوں کو اس طرح یاد کیا ہے۔ س، ح، ع چ، مس میری رو مالڈ، مس گلینی، م بیگم رکماری، ط، ج، ج، ب، ع، خ، ان معاشقوں میں احساس جمال کی شدت ہے مگر فحاشی کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اگر انہوں نے دوسروں کی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے یا کردار کشی کی ہے تو خود کو بھی بے نقاب کیا ہے اور اپنی کمزرویوں اور خامیوں کا اعتراف کیا ہے۔ احباب کے ضمن میں انہوں نے چند ہمعصر ہستیوں کو فراموش کر دیا ہے۔ اس لئے یہ باب مکمل نہیں ہے مثلاً سجاد ظہیر، مجنوں، قاسمی، سردار جعفری، سلام فیض، احتشام حسین، اعجاز حسین، مسعود حسن رضوی، آل احمد سرور اور محمد حسن وغیرہ مصطفیٰ زیدی عرف تیغ الہ آبادی کو دل کی گہرائی سے یاد کیا ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ مصنف کا نظریہ سائنٹفک سوشلزم کا ہے مارکس ولینن کے خیالات اور نظریات اسکی بنیاد ہے اور یہی ترقی پسندی کی اساس بھی ہے۔ ان کی یہ تصنیف اس لئے بھی الگ ہے کہ انہوں نے خود کو ہیرو کی شکل میں پیش نہیں کیا۔ ہے اور نہ ہی ہر علم میں طاق اور ہر فن میں مشاق نظر آتے ہیں بلکہ ایک شکست خوردہ انسان کی داستان سناتے ہیں۔ ان کے یہاں عظمت انسان اور انسان دوستی کے جذبات اس قدر مستحکم ہیں کہ وہ انسان کو انسان کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ جوش اول و آخر انسان تھے فرشتہ نہیں لہٰذا ان کی خودنوشت کو اسی طور پر سامنے رکھنا چاہئے پھر بھی اسکی ادبی حیثیت مسلم الثبوت ہے خاص طور پر اس کے خاکے جو شخصی و ادبی شخصیتوں سے متعلق ہیں۔ ایک احتجاجی کیفیت کے امانت دار ہیں۔

☆☆☆

'یادوں کی برات' کا مطالعہ

عصمت ملیح آبادی

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی سوانح 'یادوں کی برات' ان کی زندگی کے واقعات کی داستان ہے اس داستان کے وجود میں آنے کے بعد ہمیں غدر کے بعد کے ہندوستان اور اس ہندوستان میں جاگیردارانہ سماج کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، یہ کتاب جوش صاحب نے اپنے بارے میں لکھی ہے ان کا بچپن انفوان شباب، نو جوانی اور پیری کے کچوکے لگانے والی زندگی، پھر عہد شباب کی بدعنوانیاں عشق، شرارتیں، ضدیں اور غصے۔ مگر یہ سب ایک فرد کی زندگی کے حالات ہیں جوش اپنے سوقیانہ عشق نہ گناتے تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا گنا دیے تو بھی کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ جو لوگ ادب میں فرد کی اہمیت کو بنیاد بنا کر تنقید کرتے ہیں میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ تنقید نگار کو فرد کے ادب میں اجتماعی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو تلاش کرنا چاہیے۔

یادوں کی برات میں جوش ملیح آبادی بنیادی کردار ہیں۔ ہم اس کردار کو اس کی ذات کے بارے میں لکھے ہوئے تھوڑے سے واقعات سے سمجھ لیں گے لیکن اس کردار کے اردگرد جو زمانہ ہے جو سوسائٹی ہے جو تہذیب ہے جو ماحول ہے اور جو عجیب و غریب مزاج کے انسان ہیں انہیں سمجھنے کے لئے کتب خانوں اور تاریخ کے دفتروں کو چھاننا پڑے گا اس دور کے انگریز اس دور کا جاگیردار، اس وقت کے جاگیرداروں کا نوکر اس وقت کے تنگ مزاج انسانوں کو بنانے والا سماج، اس وقت کے بزرگوں کا تیکھا انداز زندگی، اس وقت کے چھوٹوں کی تہذیب اور فرماں برداری۔

کیا آپ صرف یادوں کی برات پڑھ کر یہ سب کچھ سمجھ لیں گے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔

یادوں کی برات کے زمانے کو سمجھنے کے لئے دوسری بہت سی کتابوں کو پڑھنے کی ضرورت پڑے گی اس طرح اس دور کی لمبی تاریخ اور وہ تمام حالات جنہوں نے تاریخ سازی میں حصہ لیا ہے پڑھے بغیر ہم اس کتاب کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکیں گے۔

بہت سے لوگوں نے ان واقعات کو پسند نہیں کیا جو جوش صاحب نے اپنے کردار کے بارے میں صاف صاف لکھ ڈالے ہیں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جوش نے اپنی سادہ لوحی کی بنا پر وہ واقعات بیان کر دیئے ہیں جو ہندوستانی سوسائٹی میں کبھی ظاہر نہیں کئے جاتے ، یورپ کے جن ادیبوں نے اپنی زندگی کے سیاہ کارنامے فخر کے ساتھ لکھ دیئے ہیں انہیں ہندوستانی ادب میں نمونہ بنالیا، نہ مناسب تھا اور نہ ضروری، یورپ کی تہذیب ہندوستان کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتی اگر اہل یورپ اپنے گناہوں کا اعلان کر کے فخر محسوس کرتے ہیں تو یہی بات ہندوستان میں کیوں رائج کی جائے۔اس سے نہ تہذیب کو کوئی فائدہ پہونچتا ہے نہ اخلاق ہی درست ہونے میں مدد ملتی ہے کتنے ہی نوجوان شاعروں نے جوش صاحب کی شراب نوشی کی تقلید کی اور تباہ و برباد ہو کر اپنی شاعری ہی سے نہیں زندگی سے بھی محروم ہو گئے جوش صاحب کی زندگی کی نئی حقیقتوں کو پڑھ کر بھی بہت سے نوجوان عشق و عاشقی کے کوچے میں داخل ہو سکتے ہیں اور یہ نئے مجنوں اور فرہاد سوسائٹی کو گندگی کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتے۔

اگر جوش صاحب اپنے معاشقوں کے حصّے کو یادوں کی برات میں شامل نہ کرتے تو بھی کتاب کی اہمیت کم نہ ہوتی، اہم حصّہ وہ نہیں ہے جس میں عشق و محبت کی داستان ہے۔اہم وہ ہے جہاں تاریخ ہے کردار ہیں زبان ہے جد و جہد ہے اور تنقید و تبصرہ ہے۔

مگر ہم عشق و عاشقی کے غیر ضروری حصے کی بنیاد پر پوری کتاب کو تنقیص کا نشانہ کیسے بنا سکتے ہیں۔ یہ کیسا انداز تنقید ہے کہ ایک ضخیم کتاب کے ایک باب کو لیکر پوری تصنیف کو ملامت کا نشانہ بنالیا جائے، اس پیراگراف کو دیکھئے۔اپنی مونچھوں کے کونڈوں کے سلسلے میں جوش نے جونئی سورہ رحمان لکھی ہے وہ کلام اللہ کی سورہ رحمان کی معنویت و عظمت کا مقابلہ تو کیا کر سکے گی مگر

اردو زبان میں شاید کبھی بھلائی بھی نہ جا سکے۔ سنئے

''میری مونچھوں کے کونڈے الحفیظ والاماں

پیرانہ خواتین میں اس کی وہ معصومانہ مان دان، وہ ہر طرف سے قربان، وہ رنگوں کے پیہم کھلتے سیکڑوں نشان، وہ کل یوم ہو فی الشان وہ چمکتی زمین، جھلملاتا آسمان، وہ مشک وہ زعفران وہ عود وہ لوبان، وہ ریحان وہ رمان، وہ عطر و پھول دان، وہ امنگوں کی پور پور کی گمکتی تچان، وہ ترنگوں کے رگ رگ میں کٹتے دھان وہ جھولتی گلیاں وہ جھومتے میدان وہ امریوں کی کجریاں وہ برکھا کے پکوان، وہ پی ہو، کوکو سے دلوں کے شیشے کی دکان، وہ گھپ راتیں وہ گل اوسان، وہ گوکل بن کے چھنٹے وہ بانسری کے سریلے بان، وہ رادھا کی مُسکان، وہ ہلاکو کا بازار وہ خنجروں کی دوکان، گاہے لہولہان وہ کان ہر قدم کہکشاں بر گریبان وہ عشق کے گرداب، وہ عربدوں کے طوفان، وہ نرالے بانکے انوکھے مچان وہ جھوٹے وعدے، وہ سچے پیمان، وہ پھواروں کی تول پلکھوں کے میزان، وہ کانٹوں کے حصار پھولوں کے ایوان، وہ شیشوں کے در وہ پتھر کے دربان وہ اُدھر سے سوال ہے کوئی امکان وہ ادھر سے جواب اللہ بالسلطان، وہ تواتر خطا و نسیان، وہ مسلسل عدوان، وہ سلسلہ انتقام بالاحسان، وہ قلزم حسن و عشق کا طغیان، بینھما برزخ لا یبغیان، وہ ......طرار، وہ کنواریاں نادان، وہ لہجوں کی مرکیاں، وہ بولوں کی لچکان، وہ انگھڑیوں کے ڈوروں کی گویا زبان''۔

جوشؔ کی اس قادر الکلامی اور اس نظم آزاد کو اردو شاعری میں بھی یاد رکھا جائے گا اور اردو نثر میں بھی اس طرح یادوں کی برات نے ہمیں کردار نگاری کے لئے ایک نیا انداز بیان عطا کیا ہے حکیم صاحب عالم کا ذکر شروع ہوتا ہے تو جوش کا قلم ان کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

''زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا، لکھنؤ کے حاذق و ممتاز طبیب عربی

وفارسی کے منتہی - مذہبی قصائد کے عدیم النظیر شاعر یتیموں اور بیواؤں کے
سرپرست، مملکت شرافت کے تاجدار، اقلیم خلوص، شہر یار اور کاروان
زہدوتقا کے سالار صاحب عالم کیا بتاؤں کہ کس قدر خوش رو، خوش وضع،
خوش طبع، خوش فکر، خوش اخلاق، خوش پوشاک، خوش گفتار، خوش تبسم، خوش
اوقات، خوش مدارات، خوش میزبان اور خوش مطبع تھے۔ ان کا بوٹا سا قد
تھا۔ چھوٹے چھوٹے ملائم ہاتھ تھے۔ گورا رنگ تھا اور چوڑی پیشانی تھی۔''

یہ کسی انسان کے کردار کی نایاب تصویر ہے جسے مصور کا قلم نہیں ...... انسانی کی اسرار و رموز کا ماہر شاعر ہی بنا سکتا تھا۔ اس تصویر میں جو الفاظ محفوظ ہو گئے ہیں ان کے بارے میں آج کی نسل اور آنے والی نسل تحقیق و جستجو سے کام لے گی کیونکہ اس بیچاری کو کیا معلوم کہ ''مملکت شرافت کے تاجدار'' کا کیا مفہوم ہے اور ''اقلیم خلوص'' نقشے میں کس جگہ تلاش کی جائے، وہ نہ شرافت سے واقف، نہ خلوص سے آشنا۔

خوش اخلاق و خوش مدارات و خوش میزبان کی اصطلاحوں سے اسے معلوم ہوگا کہ کبھی احلاق و مدارات و میزبانی بھی انسان کے جوہر ذاتی سمجھے جاتے تھے محض سرمایہ اور فیشن ہی نہیں۔

ڈاکٹر ایس کے سکینہ کی تصویر کھینچتے ہیں۔

''چہرے کا ملگجا سا ساؤنلہ رنگ لہجے میں بجتا چنگ، بدمزاج بیوی کے
صیدزبوں، وہ ظالم لیلیٰ یہ مظلوم مجنوں، آنکھیں ذہانت سے ضیا بار،
معقولات کے علم بردار - فلسفے کا افتخار، منطق کا وقار - کاہلی کے پرستار اور
بزدلی کے مہا اوتار۔''

اور فانی بدایونی کا سراپا ملاحظہ فرمایئے۔......

''تاج باختہ بادشاہوں - روزگار گزیدہ فن کاروں۔ امید بریدہ مریضوں،
شیب دریدہ محبوبوں۔ معشوق سوختہ عاشقوں - بریدہ رنگ بیوہ
نوعروسوں۔ پسر مردہ باپوں - اور پدر گم کردہ یتیموں کے خیمۂ سوگواری

میں بیٹھ کر مغموم قدرت نے غم دوراں وغم جاناں کے آفات، ورتھر کے مصائب اور شوپن ہار کی نامرادی کے تشت میں دیوار گریہ کی مٹی کو میر تقی میر کے آنسوؤں میں تر کر کے گوندھا، اس مٹی سے ایک دبلا پتلا گندمی رنگ کا پتلا بنایا اس پتلے کے دھڑکتے دل میں تمنائے مرگ کی روح پھونک دی اور نام رکھ دیا اس کا فانی بدایونی۔''

پھر جوش ملیح آبادی نے پاکستان میں بیٹھ کر جواہر لال نہرو کی یہ تصویر بنائی۔

''وہ اپنی موہنی صورت کی جاذبیت - اپنے رنگ کی طاقت، اپنی آنکھوں کی مروت اپنے لہجے کی غدویت - اپنے تکلم کی موسیقیت اپنے تبسم کی حلاوت اپنے خاندان کی وجاہت - اپنے دل کی آفاق در آغوش وسعت - اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت اور اپنے کردار کی بے مثال نجابت کے اعتبار سے ایک ایسے انسان تھے جو اس کرۂ خاکی پر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور جو یہ آواز بلند کر سکتے ہیں۔

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان کا وجود ہندوستان کا افتخار ایشیا کا وقار اور عالم انسانیت کا اعتبار تھا اور وہ اس عالم اجسام کے ایک ایسے ذی حیات تاج محل تھے جس کو شام اودھ کی ملاحت اور صبح بنارس کی صباحت نے الہ آباد کے معنی خیز سنگم پر گنگا جمنی چھینٹوں سے تراش کر تعمیر کیا تھا۔''

اگر یادوں کی برات ہمارے ہاتھوں میں نہ ہوتی تو جواہر لال کی یہ تصویر ہمیں کبھی دستیاب نہ ہوتی اور سروجنی نائیڈو کے بارے میں یہ کون لکھتا............

''آزادی کی شیدائی، محبت کی شہنائی۔ تقریر میں نغمۂ آب حیواں، آواز میں جمال ماہ کنعاں، گوکل بن کی مدھر بنیں، چشمہ لولو و مرجان، بلبل

ہندوستان۔''

اور فراق گورکھپوری کا اس طرح تعارف کون کراتا

''مجموعہ اضداد، آمیزۂ بلور و فولاد۔ گاہ نسیم بوستاں گاہ صرصر بیاباں گاہ خضر در گاہ گاہے گم کردہ راہ، گاہ شبنم برگ تاک، گاہ شعلہ جوالہ و بیباک۔ گاہ یزداں بہ آغوش، گاہ اہرامن بر دوش رند قدم خوار گوہر شاہوار، آسمان خوش لہجی کے بدر انجمن آگہی کے صدر اولیائے ذہانت کے قافلہ سالار، اقلیم ژرف نگاہی کے تاجدار۔ جودت پناہ۔ نقاد نگاہ۔ مہبط جبرئیل، شاعر بزرگ و جلیل''

یادوں کی برات اور جوشؔ کی تحریر نے فراقؔ کو زندہ جاوید بنا دیا، یوں اُن کی شاعری جو ہے سو ہے۔

ایسے ہی کتنے معروف و غیر معروف انسانوں کے بارے میں جوش نے جو کچھ لکھا ہے اور جس انداز میں لکھا ہے کیا وہ اُردو زبان میں اپنی آپ ہی مثال نہیں ہے کیا جوش ملیح آبادی قرآن کی زبان میں یہ اعلان کرنے کا حق نہیں رکھتے کہ یادوں کی برات کے کسی موضوع کو لے کر کوئی اپنا ہی ایک مضمون لکھ کر دکھا دے اور مدد کے لئے دوسرے ادیبوں کو بھی جمع کر لے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لئے کوئی تیار نہ ہوگا۔

یہ انسانوں کی تصویریں تھیں مگر یادوں کی برات میں موسموں کی بھی بہترین تصویریں ملتی ہیں۔ نثر میں پہلے شاید ہی کسی نے موسم کو ان الفاظ کے ساتھ گرفت میں کیا ہو۔ لیجئے یہ کمبخت گرمی کا موسم ہے جو جوش صاحب کو بالکل پسند نہیں ہے اس رقیب روسیاہ پر کیسی لعنت ملامت کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اس کی جملہ قہر مانیوں کو کس طرح الفاظ کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیتے ہیں لکھتے ہیں۔

''ارے پھٹے سے منہ کا موسم گرما۔ دھوبیا، دند کیا، ڈہکارتا، پسیتا، نچوڑتا، بھاڑیا، بھنبھوڑیا، تنوریا، چنگیزیا، چنگاریا، اکل کھرا، جل ککڑا، گھنا، روڑھا

،بڑدیتا ، لیبڑا ، سبڑا ، بھنگا شیاطین کی آنکھ کا تارا ، لوٗ کا راج دلارا ، الاؤ کا گہوارہ اور شعلوں کا فوارہ ،خونی ریچھ ،لاگو بھیڑیا۔اور بنڈیلا سور ،نفرت ہے مجھ کو اس محرور المزاج ،مغضوب ،مبغوض ،محتوب اور مردود شہدے سے ،اس کی صبحیں بھی چنگاریاں ،اس کی شامیں بھی کٹاریاں ،اس کا شعلہ خود آفتاب ایک بدتمیز گنوار کے مانند بھق سے نکل کر فوراً آگ برسانے لگتا ہے۔اس کی بے مہر کرنیں عیاذ باللہ گویا جنمی پاپی اور بوڑھے سود خوار لالہ رام لال کی نگاہ۔اس چٹ خنے چمار موسم میں جب حرام زادی لو کے جھکڑ غاؤں غاؤں اور ہو ہو کرتے چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساتویں جہنم کے گنڈے فرشتے آتش گرز مار مار کر زمین کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہیں“۔

اور اسی قلم نے جب جاڑے کا ذکر کیا تو انداز ہی کچھ اور ہو گئے۔

”آیا کنوار جاڑے کا دور –آہا جاڑا ،چمپئی شربتی ،گلابی جاڑا۔کندن سی دمکتی انگیٹھیوں کا گل زار اس لچکے پھٹے کی رضائیوں میں لپٹا ہوا دلدار ، دل کا سرور آنکھوں کا نور ،دھند لکے کا راگ جھٹپٹے کا سہاگ۔زلیخا کا خواب ، یوسف کا شباب ۔خدیو بریط وچنگ شاہزادہ راگ ورنگ۔ روئی دوئی کا بسیتا مسلم کا قرآن ،ہندو کی گیتا۔اور صبح کو سونے کا جال رات کو چاندی کا تھال ۔قصیر النہار طویل اللیل –تنگ آستین دراز گیسو،موتی کی آب موتیے کی بو باس ،رگوں میں چٹکیاں لیتی سردی۔چہروں پر انگڑائیاں لیتی سرخی ،مہکتے لحافوں کی نیند ،چٹکتے انگاروں کا ناچ۔شمس در آستیں ،قمر جبیں ، ٹھڈی تارا ماتھا چاند ، ماہ رو ،مومن خو ، گبرو چکیلا ، چھریرا ،مدھو بھرا ، بانکا ، ترچھا ،نکیلا ،لپیٹلا رسیلا چھبیلا ، سجیلا ،سنولا ، سلونا اور سنہرا جاڑا“۔

اور پھر تیسرا موسم آ گیا موسم برسات اور جوش نے اردو زبان میں اس موسم کی تعریف

لکھ کر جیسے دوسری تمام زبانوں کو چیلنج کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ جامع اور مکمل تعریف کے لئے تمہارے پاس الفاظ ہوں یا تمہاری زبان میں ایسی کوئی تحریر موجود ہو تو پیش کرو۔

''روم جھوم بدروا برسے۔ پی درشن کو جی ترسے اور جھوم بدروا برسے او ہو، جھومتی جھمکتی، جھر جھراتی، چھم چھماتی، جھم جھم برستی جھجوں والی چھوٹتی برسات، گھپ اندھیرا اور گھنگھور گھٹائیں، چھاؤں میں گھرتی، کھوئی گھر میں گھوزائی، لچکتی ہوا، گرجتی گونجتی، گھر گھڑائی گھونگھر والی برکھا۔ آسمان کو گھماتی، زمین کو نچاتی فضا کو جلاتی شمس وقمر کو گہناتی، چوپائی کو تھپتھپاتی، طوفانوں پر طوفان اٹھاتی، زلفیں چھنکاتی، کجریاں سناتی، کھیتیاں لہلہاتی، زمین کی پوریں چٹخاتی اور چھٹرے کو کڑے سے بجاتی برکھا، البر سیاہ بیاباں در بیاباں گلستاں در گلستاں گل چکاں، گوہر فشاں رقصاں، برّاں، غلطاں رواں دواں، آسمان پا بجولاں نے میں کشاں کشاں، لکتے بال کشادہ نعرہ زناں اور سر سے پاؤں تک دھواں ہی دھواں...... اللہ اللہ وہ مچلتی گھٹائیں وہ چڑھتے دریا، وہ گرجتے نالے، وہ تھرکتے ولولے، وہ کوکتی ترنگیں، وہ ابلتی امنگیں، وہ چمکتے رنگ اور وہ زبردست و پرشور دونگڑے اور ایسی گرجتی پروائی کہ دھرتی بولے رام دہائی۔''

اسی کتاب میں جوش نے ایک جگہ اپنا تنقیدی نظریہ پیش کیا ہے انہوں نے شاعری کے ترجمے کے بارے میں لکھا۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ شاعری ایک ایسا جادو ہے جس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعری آبگینہ ہے اور ترجمہ گھن شاعری شیشہ ہے اور ترجمہ پتھر، شاعری حباب ہے۔ اور ترجمہ ہوائے تند کا تھپڑا جب شاعری کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس کا کندن مٹی کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے اس کے لالہ و گل پلاسٹک کے پھولوں کا لباس پہن لیتے ہیں اور اس کا شعلہ جوالہ راکھ میں مل کر رہ جاتا ہے۔ میں یہاں تک مان لینے پر تو اپنے کو آمادہ کر سکتا ہوں کہ فکری اور آفاقی مسائل کی شاعری کا تو کسی حد تک

ترجمہ ہو سکتا لیکن شاعری کے اس کھنکتے طلسمی دائرے میں ترجمہ باریاب نہیں ہو سکتا جہاں الفاظ کو ان کے لغوی معنی سے جدا کر کے استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے سروں پر بالکل جدید معنی کے تاج رکھے جاتے ہیں جہاں لہجوں کی ایک ایک کروٹ اور الفاظ کی ایک ایک پرت کے نیچے سے نئے نئے مطالب کے صدہا چشمے پھوٹا کرتے ہیں......

مترجم جب اس دائرہ رقصاں کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے تو اس کے الفاظ کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں اس کی تخیل کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور اس کے وجود کا ڈورا چٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

غرض جوش ملیح آبادی نے یادوں کی برات لکھ کر اردو ادب کو ایک ایسا شاہکار عطا فرمایا ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

☆☆☆

خاشاک کہہ رہا ہے جسے تو وہ پھول ہے
ناداں! صباحِ غنچہ کشا بھی رسول ہے

جوش

تبصرے

اردوناول کے ہمہ گیر سروکار
(۱۸۶۹-۲۰۰۷)

مصنف: ڈاکٹر ممتاز احمد خاں
مبصر: فخر الکریم

ادھر چند برسوں میں اردو فکشن کی تنقید جن معتبر ہاتھوں میں پہنچی ان میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا نام کافی نمایاں ہے۔'اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار' ان کی حالیہ تصنیف ہے۔اس کے پہلے ان کی تین کتابیں 'اُردو ناول کے بدلتے تناظر'، 'آزادی کے بعد اردو ناول' اور 'اردو ناول کے چند اہم زاویے' شائع ہو چکی ہیں 'اردو ناول کے چند یادگار کردار' منتظر اشاعت ہے۔

'اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار' ان کے سولہ ۱۶ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کچھ جدید ناول کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ اردو ناول کی نظریاتی بنیادوں اور اس کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔کتاب کا سب سے طویل اور اہم مضمون 'اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار' ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مراۃ لعروس' (۱۸۶۹ء) سے لے کر اب تک کے لکھے جانے والے ناولوں کے منظر نامے کو سامنے لانے کی کوشش ہے۔اردو ناول کے تقریباً ایک سو پچاس برسوں کے سفر میں اسلوب، مواد، موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے جتنے اہم موڑ آئے ان کا مطالعہ بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔اس مطالعہ میں شاید ہی کوئی ایسا ناول چھوٹا ہو جس کا ذکر اس میں نہ ہو۔اس کے علاوہ تحریک آزادی اور ہمارا ناول، پاکستان، معاصر ناول، ناول کی عظمت اور ضرورت، پاکستان ناول آئندہ؟ ایسے مضامین ہیں جن سے مصنف کی وسیع النظری، تمام اچھے اور بڑے ناولوں پر فنی گرفت، انگریزی ناولوں سے واقفیت اور اردو ناول کی تاریخ پر عمیق نظر کا پتہ چلتا

ہے۔''پاکستان معاصر ناول'' پاکستان میں ۱۹۸۰ء کے بعد لکھے جانے والے ناولوں کے موضوعات، رجحانات، اسالیب اور ہیتی تجربات سے روشناس کراتا ہے۔'ناول کی تفہیم اور تعبیر کی دشواریاں' اس نقطہ نظر سے اہم ہے کہ ناول جیسی بڑی اور ہمہ گیر فکر کی حامل صنف ادب کی جانچ اور پرکھ میں عملی دشواریوں کی جانب توجہ کی گئی ہے۔

''کئی چاند تھے سرِ آسماں' غلام باغ کاغذی گھاٹ، جنت کی تلاش، العاصفہ، اور عبداللہ حسین جوگیندر پال وغیرہ کے ناولوں کے تجزیے کے ذریعہ اردو ناول کے ارتقاء میں ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح سے ان مضامین کے ذریعہ مصنف نے نہ صرف کچھ جدید ناولوں کا تجزیہ کیا ہے بلکہ ناول کی تنقید کے نئے معیار و میزان بھی قائم کیے ہیں۔

کتاب ماجرا سرائے پبلی کیشنز کراچی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ قیمت ۲۵۰/روپیہ اور سن اشاعت ۲۰۰۸ء ہے۔☆☆

ضربِ تنقید

مصنف: ناصر بغدادی
مبصر: علی احمد فاطمی

ضربِ تنقید ممتاز افسانہ نگار، مُدیر اور اب ناقد ناصر بغدادی کے اداریوں اور مضامین کا گراں قدر مجموعہ ہے۔ تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اداریوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ اداریے کم علمی و معروضی مضامین زیادہ ہیں ان مضامین (اداریوں) میں بڑی جرآت و جسارت کے ساتھ سچ بولنے کی کوشش کی ہے وہ سچ جو ان دنوں ہندو پاک کی اردو دنیا میں مقصود و معدوم ہے۔ پاکستان میں ادب مافیا کے پول کھولے گئے ہیں۔ نوک نیزہ پر حرف حق اور جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بھی خیریت دریافت کی گئی ہے اور ادب میں تعصبات کے مسائل بھی اُٹھائے گئے ہیں۔ حمید نسیم پر بھی ایک طویل مضمون شامل ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے جسے عام طور پر ناپسند ہی کیا جائے گا لیکن ناصر بغدادی پسند اور ناپسند سے بے نیاز اپنے علمی

وادبی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ افسانے لکھتے ہیں اور افسانے پر مضمون بھی۔ ضرب تنقید ایک قابل قدر کارنامہ ہے جھوٹ کے اس دور میں سچ کا برملا اظہار وانعکاس۔ ☆☆

فیض کا عمرانی فلسفہ

مصنفہ: ڈاکٹر صغریٰ صدف

مبصر: عزیزہ بانو

'فیض کا عمرانی فلسفہ' (تحقیق وتنقید) ۲۰۰۵ء میں رائٹرس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ملٹی میڈیا افیرس لاہور کے اشاعتی ادارہ سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کی مصنفہ صغریٰ صدف صاحبہ ایک معروف شاعرہ۔ محقق، ناقد، ماہر تعلیم اور فلسفہ میں۔ پی۔ اچ۔ ڈی ہیں۔

فیض کے عمرانی فلسفہ پر لکھی گئی یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب سے پہلے مصنفہ نے تعارف کے عنوان سے ایک مختصر باب فیض کے حالات زندگی کے متعلق قائم کیا ہے۔ اس میں ان حالات وواقعات کا ذکر کیا ہے جس نے براہ راست یا بالواسطہ فیض کی زندگی اور ان کی شاعری کو متاثر کیا۔

پہلا باب فیض اور ترقی پسند تحریک کے عنوان سے ہے۔ ترقی پسند تحریک کی پندرہ سالہ ادبی خدمات کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے فیض کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور اس عہد میں ان کی شاعری کے فکری وفنی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ایک مخصوص نظریہ حیات سے وابستگی کے باوجود ان کی شاعری میں وقتی کھوکھلے نعروں کے بجائے خلوص سچائی اور مقصد کا بھرپور احساس ہے کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرا باب فیض اور آزادی کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں آزادی کے مفہوم پر معاشرے میں آزادی کے بدلتے ہوئے تصور، مختلف ادیبوں، فلسفیوں کی آراء کا ذکر کرتے ہوئے معاشی اور جسم وذہن کی آزادی کے مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فیض کے کلام میں آزادی

کے تصور کو شاعری کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان فیض اور عدل ہے۔ عدل کے مفہوم پر بحث کرتے ہوئے مشرقی و مغربی مفکرین کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی فیض کے کلام سے مثالیں دیتے ہوئے فیض کے تصور عدل پر بحث کی گئی ہے۔

چوتھے باب کا عنوان فیض اور امن ہے۔ اس باب میں فیض کی زندگی میں امن کی اہمیت، اور اس ضمن میں ان کی کوششوں پر ان کے کلام کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہے

آزادی، عدل اور امن انسانی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ فیض کی زندگی میں ان کی کیا اہمیت تھی اور انسانی زندگی میں ان کی کیا اہمیت ہے اس کتاب کے ذریعہ اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فیض کے عمرانی فلسفہ پر یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ فیض کی شاعری کو اس نظریہ سے دیکھنے کی پہلی کوشش۔ فیض کی شاعری میں آزادی، عدل اور امن کے موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوگی۔ ☆☆

ایک صدی کا قصہ

مصنف: انوار احمد

مبصر: علی احمد فاطمی

اس کتاب میں ایک صدی کی قصہ گوئی کو بڑے تحقیق و تنقیدی انداز میں پیش کیا گیا ہے ظاھر ہے کہ یہ ایک نہات مشکل کام تھا جسے انوار احمد نے انجام دیا۔ اس کتاب میں ۱۵۲ افسانہ نگاروں کے حالات اور افسانوں کے بارے میں معلومات افزا باتیں کی گئی ہیں۔ ابتدا راشد الخیری سے ہوئی ہے اور اختتام احمد اعجاز بھلر پر۔ ۹۲۱ صفحات پر مشتمل یہ کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ روایت سے متعلق ہے دوسرا حاصل اور تیسرا امکانات۔ اتنے ڈھیر سارے نام ہیں۔ کہ بعض کے بارے میں شک و شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں اس کے باوجود مصنف کو قلق ہے کہ کچھ نام رہ گئے۔ ابتدا میں قصے کا فن اور اردو قصے کی کہانی کے عنوان سے دو کارآمد مضامین ہیں۔

بلا شک وشبہ یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز ہے اور جیسے انوار احمد صاحب نے غیر معمولی محنت سے ترتیب دیا ہے۔ جس کے بارے میں فتح محمد ملک نے کہا ہے۔ ''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اردو فکشن سے ان کی محبت جبلی ہو انھوں نے اپنی شعوری زندگی کا بیشتر حصہ فکشن کی تخلیق۔ تحقیق اور تنقید کی محبت میں بسر کیا ہے۔'' اس ضخیم اور یادگار کتاب کو مقتدرہ قومی زبان نے شائع کیا ہے۔ ☆☆

پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول

مصنفہ: ڈاکٹر نجمہ صدیق

مبصر: صالحہ زریں

ڈاکٹر نجمہ صدیق ایسوسی ایٹ پروفیسر لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی میں تعلیم وتدریس کا کام انجام دے رہی ہیں۔ یہ کتاب تین سوستر صفحات پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی خواتین ناول نگاروں کو ملا کر تیرہ ناول نگاروں اور اُن نمائندہ ناولوں کو شامل کیا ہے جس میں انھوں نے مصنف کا تعارف اور ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے قرۃ العین حیدر کے مقبول ناول آگ کا دریا کو لیا ہے اور ناول کے مسائل، کردار، فن، زبان و بیان، اصول وتکنیک سب پر باتیں کی ہیں اور نجمہ صدیق یہ بھی مانتی ہیں کہ قرۃ العین حیدر نے ناول کو جدید خوبیوں سے آراستہ بھی کیا ہے۔ نجمہ صدیق نے الگ الگ خواتین ناول نگاروں کو لے کر اُن کے ابتدائی حالات اور کس خاندان سے اُن کا تعلق ہے اور وہ ادب کے میدان میں کب داخل ہوتی ہیں۔ آزادی کے پہلے یا آزادی کے بعد، اگر آزادی کے پہلے لکھنا شروع کیا تو اُس وقت ان کے یہاں مسائل کیسے تھے اور آزادی کے بعد عالمی مسائل کس طرح کے ہیں اور یکے بعد دیگرے وہ ایک کے بعد ایک ناول نگار کے تخلیقی کارناموں سے لے کر حیات وزندگی پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ اسی طرح ''آنگن'' کے بارے میں موصوفہ نے لکھا ہے کہ خدیجہ مستور کے ناولوں میں حال اور ماضی کی ایک وحدت سی نظر آتی ہے اور اس ناول میں پاکستان کا قیام میں آنے کا اشارہ بھی ہے۔ آبلہ پا از رضیہ فصیح احمد، سبزی گیہوں از نشاط فاطمہ،

حسرت عرض تمنا از فرخندہ لودھی، راجہ گدھ از بانو قدسیہ، کاروان وجود از نثار عزیز بٹ، جلتا مسافر از الطاف فاطمہ، دشت سوس، از جمیلہ ہاشمی، حاصل گھاٹ از بانو قدسیہ، کاغذی گھاٹ از خالدہ حسین وغیرہ کا تعارف اور ان کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ تفصیل کے ساتھ لیتی ہیں۔

ادب کے میدان میں خواتین تخلیق کاروں کا خاصہ اہم حصہ رہا ہے اور ان کی ان کاوشوں کو پڑھ کر یہ محسوس بھی کیا جاسکتا ہے کہ خواتین ناول نگار زندگی کے ہر پہلو پر فکر کرتی ہیں اور اپنی تصنیف میں نمونے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔قومی اور عالمی مسائل پر بھی ان کی فکر ہوتی ہے اور جا بجا خواتین کے تخلیق کارناموں میں انسانی مسائل، سیاسی وسماجی جبر حقوق، مساوات، تحریکات، نفسیاتی کیفیات کو اپنے تخلیق کو سمیٹ کر اس کا حل تلاش کرنا ان کا اوّل فریضہ رہا ہے۔

اس نقطہ نظر سے نجمہ صدیق کی یہ کتاب کارآمد ہے کہ انھوں نے ہندوستانی اور پاکستانی دونوں ملکوں کو اکھٹا کر کے تخلیق اور فکر ونظر کا کام بڑی محنت اور لگن کے ساتھ کیا ہے۔اور فکشن کی دنیا میں اس کا خیر مقدم بھی ہوگا۔☆☆

مابعد جدیدیت کا دوسرا رخ

مصنف: ضمیر علی بدایونی

مبصر: علی احمد فاطمی

مابعد جدیدیت کے حوالے سے ھندوستان میں جو حیثیت گوپی چند نارنگ یا وہاب اشرفی کی ہے پاکستان میں کم وبیش وہی مقام ضمیر علی بدایونی کا ہے۔وہ اس موضوع پر کئی کتابیں رقم کرچکے ہیں۔یہ کتاب ضمیر علی بدایونی نے اپنی زندگی میں تو لکھ لی لیکن اشاعت سے قبل انتقال کرگئے لیکن ان کے لائق فرزندوں اور دوستوں نے اسے اشاعت کی منزل تک پہنچایا۔اس کتاب میں مختلف مضامین ہیں مختلف شاعروں اور ادیبوں کو مابعد جدید تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور جو مابعد جدیدیت پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں اس کے جوابات بھی دے گئے ہیں۔مصنف نے اس کتاب کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اپنی پہلی کتاب مابعد جدیدیت (ایک ادبی

اور فلسفیانہ مخاطبہ) پڑھنے کی سفارش کی ہے۔ کہانی کا فن۔ نسائی تحریک۔ میر، اقبال پر تو مضامین ہیں ہی مرزا بیدل پر پورا ایک گوشہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ معاصرین میں حسن عسکری، قمر جمیل وغیرہ، پر بھی مضامین ہیں۔ پاکستان میں تنقید کا حصہ کمزور سمجھا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں علمی تنقید کی ایسی کتابوں کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔☆☆

افسانے

مرتب: احمد ندیم قاسمی

مبصر: صالحہ زرین

اس عنوان کے تحت احمد ندیم قاسمی کے چالیس افسانوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت وانفرادیت یہ ہے کہ یہ انتخاب خود احمد ندیم قاسمی نے کیا تھا۔ اپنے تمام مجموعوں میں سے دو دو چار چار افسانوں کو منتخب کر کے یہ کتاب تیار کی گئی ہے دو ایک افسانے غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ایک بیحد اہم افسانہ نگار ہیں تقریباً دس مجموعے ہیں جواب نایاب اور کمیاب ہیں اس لے یہ انتخاب ان معنوں میں بیحد کارآمد ہے کہ عمدہ اور منتخب افسانے ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں اچھا ہوتا کہ قاسمی صاحب ایک اچھا سا مقدمہ بھی لکھتے جس سے اس کی اہمیت اور تاریخیت اور بڑھ جاتی۔ ۶۳۲ صفحات کی اس معیاری اور خوبصورت کتاب کو سنگ میل لاہور نے شائع کیا ہے۔☆☆

جدید اردو افسانے کے رجحانات

مصنف: سلیم آغا قزلباش

مبصر: حسین جیلانی

ایک خیال ہے کہ پاکستان میں شاعری زیادہ اچھی ہو رہی ہے فکشن کا حصہ نسبتاً کمزور ہے اور فکشن کی تنقید اس سے بھی زیادہ کمزور۔ لیکن گزشتہ دنوں افسانے کی تنقید پر جس نوع کی

کتابیں منظر عام پر آئی ہیں اس کے پیش نظر اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب اس کی عمدہ مثال ہے۔ ۶۹۰ صفحات اور ۶ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں قدیم اور جدید افسانوں اور اس کے فکر وفن پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ افسانے کے ابتدائی نقوش سے لے کر جدید افسانے پر عملی اور معروضی گفتگو سامنے آتی ہے۔ نیر ہجرت نسائیت دیہات۔ شہر وغیرہ، اِس بحث میں شامل ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہے۔ ابتدا میں جمیل الدین عالی اور سجاد نقوی کی آراء بھی شامل ہیں اور مصنف کا پیش لفظ بھی۔☆☆

اردو تنقید کا عمرانی دبستان
مصنف: ضیاالحسن
مبصر: علی احمد فاطمی

ضیاالحسن شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے وابستہ ہیں اور ایک خیال کے مطابق ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا۔ لیکن حال میں شائع ہوئیں ان کی دو تین کتابیں ان کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بقول وحید قریشی کہ عمرانی تنقید نصف صدی سے لکھی جارہی ہے لیکن اس کا تفصیلی جائزہ اب تک نہیں لیا گیا۔ بے شک اس کتاب میں بڑے حوصلے اور عرق ریزی کے ساتھ اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے۔ کتاب چھ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں عمرانیات اور ادبی تنقید کے رشتوں پر کارآمد گفتگو کی گئی ہے اس کے بعد سرسید تحریک۔ ترقی پسند تحریک۔ بعد کی تنقید اور جدید تنقید میں عمرانیات کے عناصر تلاش کے گئے ہیں جس میں مصنف کامیاب ہے۔ ہندوستان میں تنقید کا بازار گرم ہے لیکن اس موضوع پر ایسی عمدہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ ایسی عمدہ اور کارآمد کتاب کی تصنیف کرنے پر مصنف کو جتنی بھی مبارک باد دی جائے کم ہے۔☆☆

ن ۔م ۔راشد شخصیت اور فن

مصنف: ضیا الحسن

مبصر: علی احمد فاطمی

اکادمی ادبیات نے پاکستان ادب کے علماء کی سیریز چلائی ہے۔ زیرنظر کتاب اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ن ۔م ۔راشد ایک اہم ادبی شخصیت کا نام ہے۔ ان کی بد قسمتی یہ رہی کہ وہ فیض، مجاز، احمد ندیم قاسمی کے عہد میں پیدا ہوئے اور ان کی شہرتوں کے شور میں ان کا نام دب سا گیا۔ لیکن اگر شخصیت اور کارنامے اہم ہیں تو کسی نہ کسی اسٹیج پر یاد کیا جانا ضروری ہوتا ہے چنانچہ اس کتاب کو اسی صورت میں دیکھنا چاہئے۔ کتاب کی ابتدا سفر حیات سے ہوتی ہے اس کے بعد ان کی شاعری پھر تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں ترجمہ نگاری اور کچھ نایاب اور غیر مطبوعہ چیزیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں کتابیات کے حوالے ہیں۔ تعارف اور تجزیہ کے طور پر یہ کتاب اھمیت رکھتی ہے۔ ☆☆

زخ ش ۔حیات و شاعری

مصنف: فاطمہ حسن

مبصر: عزیزہ بانو

زخ ش سے مُراد ہے زاہد خاتون شروانیہ لیکن ادبی مسائل میں وہ زخ ش کے نام سے لکھتی تھیں اس لئے مصنفہ نے اسی عنوان کے تحت پی، ایچ، ڈی کا کام کیا تھا۔ فاطمہ حسن ایک اچھی شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں اور خوب شہرت رکھتی ہیں لیکن اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیت کا بھی سکہ جما دیا ہے۔ ایک بیحد اہم لیکن گمنام خاتون جس کا تعلق ھندوستان سے رہا ہے اور وہ پاکستان کے قیام سے قبل ھی رخصت ہوگئی اور وہ بھی جوان ہی لیکن

اس کم عمری میں بھی انھوں نے ایسے کام کئے جو یادگار تھے لیکن زمانے کی گرد اور وقت کی گردش میں دبے ہوئے لیکن فاطمہ حسن نے واقعی بیحد محنت و تلاش کر کے ایک غیر معمولی کتاب لکھ دی اور اس گمنام خاتون کو نئے سرے سے دریافت کر کے آباد کر دیا کتاب میں ان کے سوانحی کوائف کو کچھ زیادہ ہی تفصیل سے پیش کیا گیا اور شاعری سے متعلق ایک باب ہے۔ تاہم اس کتاب کی انفرادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، چار سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔☆☆

مضامین سلیم احمد

مرتب: جمال پانی پتی

مبصر: حسنین اختر

سلیم احمد ہمارے عہد کے ایک ممتاز نقاد، اسکالر اور دانشور ہیں۔ جدید تنقید کے حوالے سے ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ کچھ کتابیں جو بے حد مشہور ہوئیں اور دستیاب بھی ہیں لیکن ادھر ادھر بکھرے ہوئے مضامین کی دستیابی مشکل تھی۔ جمال پانی پتی نے یہ کام عمدہ کیا کہ ان کی تقریباً تمام چیزوں کو یکجا کر دیا اور اس طرح ۸۷۸ صفحات کی کتاب ترتیب دیدی۔ سلیم احمد عموماً نئی نظم اور پورا آدمی یا غالب اور نیا آدمی کے حوالے سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں دیکھا جائے تو نیا آدمی اور پورا آدمی کی بحث ھی چلائی سلیم احمد نے لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے اردو کی کلاسیک پر بھی بہت اچھے مضامین لکھے ہیں مثلاً انیس۔ اکبر۔ اقبال۔ سرسید اور سب سے قابل غور بات یہ ہے کہ جوش پر ان کے پانچ مضامین ہیں اور بھی بہت کچھ ہے فلسفہ۔ تہذیب۔ اسلامی ادب۔ تعلیم۔ کلچر غرض کہ ان کی تمام چیزوں کے یکجا ہو جانے سے یہ ہوا کہ سلیم احمد پورے آدمی کی شکل میں پہچانے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب کو اکادمی بازیافت نے شائع کیا ہے۔☆☆

آپ سوچتے کیوں نہیں

مصنف: شہزاد احمد

مبصر: علی احمد فاطمی

شہزاد احمد لاہور میں رہتے ہیں اور وہاں کے تاریخی وثقافتی ادارے مجلس ترقی ادب کے سربراہ ہیں بنیادی طور پر شاعر ہیں اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔گزشتہ ملاقاتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ نرے شاعر یا پبلشر نہیں ہیں بلکہ مفکر اور دانشور ہیں جس کا ثبوت ہیں وہ کتابیں جو سماجیات، معاشیات وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔زیر نظر کتاب اسی نوعیت کی ہے۔آپ سوچتے کیوں نہیں۔کیا زندگی بغیر سوچے سمجھے گزاری جاسکتی ہے کچھ لوگ گذارتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ یہ انسانیت کا پست ترین مقام ہے جہاں حیوان اور انسان کا فرق نہیں رہ جاتا۔ان کا خیال ہے کہ انسان نے اب تک جتنی ترقی کی ہے وہ سوچنے کی وجہ سے کی ہے۔سوچنے سے ہی منطق اور فلسفہ کا جنم ہوتا ہے۔بہر حال اسی نوعیت کے خیال اور سوال کو پیش کرتی ہے یہ کتاب جو بڑی عجیب ہے لیکن بیحد کارآمد۔اس کتاب کے لئے مصنف کو جتنی بھی مبارک باد دی جائے کم ہے۔کتاب کو سنگ میل نے شائع کیا ہے۔☆☆

اردو غزل کا تکنیکی ہیئتی وعروضی سفر

مصنف: ارشد محمود ناشاد

مبصر: شہنواز عالم

اردو ادب کی سب سے محبوب صنف ہے غزل۔پوری شاعری غزل سے بھری پڑی ہے۔غزلیہ شاعری پر تنقید بھی خوب خوب ہوئی ہے لیکن فکری زیادہ فنی کم۔۔تہذیبی زیادہ عروضی کم۔اس کتاب میں غزل کو خالصتاً فنی تکنیکی اور عروضی نظر سے دیکھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جو چھ ابواب میں تقسیم ہے پہلے باب میں تکنیک اور حقیقت اور

عروضی کے خط و خال پیش کئے گئے ہیں اس کے بعد غزلگوئی کے سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حالی سے ماقبل اور پھر حالی سے اقبال تک آخر میں جدید غزل کا محاسبہ اور سب سے آخر میں غزل کے مستقبل پر بھی باتیں کی گئی ہیں ان دونوں فکشن اور اس کی تنقید پر اتنا کچھ لکھا جا رہا ہے کہ غزل جس نے شاعری کو آبرو بخشی نظر انداز ہوتی ہیں۔ ایسے میں اس کتاب کی اشاعت ایک مبارک قدم ہے۔ ۲۷۳ صفحات کی اس کتاب کو مجلس ترقی ادب نے شائع کیا ہے۔☆☆

تہذیب وتخلیق

مصنف: محمد رضا کاظمی

مبصر: اسلم الہ آبادی

پاکستان اسٹڈی سنٹر کراچی یونیورسٹی کا ایک ایسا ادارہ ہے جو ڈاکٹر جعفر احمد کی نگرانی میں غیر معمولی کام انجام دے رہا ہے۔ نشر و اشاعت کے سلسلے میں تو اس نے یادگار کام کئے ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی ادارے کی اشاعت ہے۔ یہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو کئی حصوں میں تقسیم ہے ابتداً قدیم ادب سے متعلق مضامین ہیں دوسرے حصہ میں پاکستانی تہذیب و ادب پر گفتگو کی گئی ہے تیسرے میں جدید شعر و ادب پر گفتگو ہے اس کے بعد طنز و مزاح۔ پھر افسانہ۔ آخر میں جنرل مضامین۔ تقریباً چالیس مضامین میں جوش کہیں نہیں ہیں شاید وہ پاکستان اسٹڈی کا حصہ نہیں۔ ایک استقبالیہ شمس الرحمٰن فاروقی کا بھی ہے۔ بہر حال کار آمد مضامین ہیں جسے سنٹر نے بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے۔☆☆

مشفق خواجہ

مرتبین: ساحر شیوی۔ صابر ارشاد عثمانی۔ معراج جامی

مبصر: نعیم السحر صدیقی

مشفق خواجہ ہمارے عہد کے صف اول کے طنز و مزاح نگار۔ کالم نویس، محقق و ناقد

رہے ہیں، بڑی دلنواز شخصیت کے مالک۔ وضعداری اور رواداری ان کی شخصیت کے جوہر۔ ان کی رحلت کے بعد اردو دنیا نے ان کی بڑی کمی محسوس کی۔ چنانچہ یہ کتاب ان کی اسی کمی اور غیر موجودگی کا ایک ایسا عقیدت مندانہ اظہار ہے جس کی پذیرائی ھونی چاہئے۔ یہ کام یوروپین رائٹرز سوسائٹی لندن نے انجام دیا اور اس کے مرتبین ایسے لوگ ہیں جو دیار مغرب میں اردو کی غیر معمولی خدمات انجام دے رہیں ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی خدمت کی یادگار کڑی ہے، اس کتاب میں مشفق خواجہ پر لکھے گئے نامور ادیبوں کے مضامین ہیں۔ نذرانۂ عقیدت ہے۔ خطوط ہیں جو دوسروں نے لکھے اور جو مشفق خواجہ نے لکھے۔ بہر حال یہ ایک کارآمد کتاب ہے اور اس بات کا تہذیبی جذباتی اظہار کہ ہم اپنے مرحومین بزرگوں کو یاد رکھتے ہیں خصوصاً وہ لوگ جنھوں نے بڑے کام کئے ہیں۔☆

وصیت نامے

مصنف: عطاالحق قاسمی

مبصر: علی احمد فاطمی

عطاالحق قاسمی پاکستان ہی نہیں عالمی اردو ادب کے جانے مانے طنز و مزاح نگار اور کالم نویس ہیں۔ بیحد کام کیا ہے اور کررہے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو طنز و مزاح ان کا اصلی میدان ہے اور یہ ہنر پاکستان میں کچھ زیادہ ہی کھلا۔ ایک خیال ہے کہ جس معاشرہ میں گھٹن اور حبس ہو وہاں غزل کی شاعری اور نثر میں طنز و مزاح نگاری خاصی پھلتی پھولتی ہے۔ پاکستانی معاشرہ کی حد تک یہ بات پورے طور پر درست ہے۔ عطاالحق قاسمی اس کی زندہ مثال ہیں وہ خود تو زندہ دل انسان ہیں ان کی تحریر میں بھی زندہ دلی۔ شوخی اور ظرافت خوب خوب ہے۔ چونکہ قاسمی صاحب کے پاس غیر معمولی تجربات اور مشاہدات ہیں جس نے ان کی شوخی گفتار میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ وصیت نامے کا عنوان ہی بتاتا ہے کہ اس میں کیا کیا ہوگا۔ طنز و مزاح پہ ایک عمدہ کتاب ہے جسے ضرور پڑھا جانا چاہئے۔ ادارہ عطاالحق قاسمی کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔☆☆

احمد فراز

مصنف: اشفاق حسین

مبصر: خواجہ جاوید اختر

زیر نظر کتاب احمد فراز سے متعلق ان یادوں کے حوالے سے ہے جو انھوں نے کنیڈا میں اشفاق حسین کے ساتھ ایام اور لمحات گذارے ہیں۔ اشفاق حسین خود اچھے شاعر و ادیب ہیں۔ ادیبوں کو مدعو کرنا۔ تقریبات کرنا اور ان کی خدمت وضیافت کرنا ان کے خلوص عمل کا نایاب جوھر ہے۔ اسی ضمن میں بڑے ادیبوں سے متعلق یادوں کو مجتمع کرنا اور اسے کتابی شکل دینا بھی ایک مستحسن عمل ہے۔ اس سے قبل وہ فیض سے متعلق بیحد اہم کتابیں لکھ چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی بیحد دلچسپ اور اہم ہے جس سے احمد فراز کی شخصیت اور شاعری پر کارآمد روشنی پڑتی ہے۔ اشفاق حسین نے اسے خود شائع کیا ہے۔ آخر میں انتخاب کلام بھی پیش کیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ایسی کارآمد کتاب لکھنے پر مصنف کو مبارک باد دی جاتی ہے۔ ☆☆

جوش شناسی

دوسرا شمارہ: ستمبر ۲۰۰۸ء

مبصر: نعیم السحر صدیقی

''جوش بانی'' ہندوستان میں جوش سے آگاہی بہم پہنچا رہا ہے ایسے میں ایک تشنگی محسوس ہوتی اگر پاکستان میں بھی ایسی کوئی کوشش نہ کی جاتی کیونکہ جوش ایک متحدہ ہندوستان کے شاعر تو تھے ہی لیکن بعد میں پاکستان بھی چلے گئے تھے۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہو کر پاکستان میں رحلت فرما گئے تھے ایسے میں ہلال نقوی صاحب نے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اپنی تحقیق و تدوین کی خدمات جاری کی ہیں۔ اِس سے قبل وہ ''رثائی ادب'' سہ ماہی کا کراچی سے اجراء کر چکے ہیں جس

کا چوتھا شمارہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء جو اتفاق سے جوش ملیح آبادی نمبر بھی تھا مجھے دستیاب ہوا تھا۔ اِس کے علاوہ اُن کی متعدد تصنیفات بھی جوش کے حوالے سے منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جوش کے حوالے سے اُن کے تجربات بہت وسیع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان اور خاص طور سے پوری دنیا جس نشیب وفراز سے گزر رہی ہے اُس نے پروفیسر علی احمد فاطمی، اقبال حیدر اور ہلال نقوی صاحب کو جوش جیسے بے لوث، بغاوت پسند اور جرأت مند شاعر کی تلاشِ نو پر مائل کیا ہے۔ ہلال نقوی صاحب کی جوش شناسی آج اُس انتہا پر پہنچ گئی ہے کہ جوش ملیح آبادی کا نام آتے ہی ہلال نقوی کا نام خود بخود ذہن میں آجاتا ہے۔

ہلال نقوی صاحب اپنے رسالے ''جوش شناسی'' سے بہت پُر امید نظر آتے ہیں اُنہیں یہ یقین ہے کہ مادّیت کے اِس عہد میں ادب کی اہمیت کو قائم رکھیں گے۔ ''جوش شناسی'' (دوسرا شمارہ: ستمبر ۲۰۰۸ء) کو اہلِ دانش کی نظر میں جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اُس سے ۳۶ صفحات پر قارئین کو متعارف کرایا گیا ہے۔ اِس دوسرے شمارے کے اداریے میں ہلال نقوی نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ ''جوش شناسی کا جریدہ ناواقفیت سے نکل کر واقفیت کی طرف سب کو لے کر چلنا چاہتا ہے۔'' (ص ۳) ابھی تک کہا جاتا رہا ہے کہ جوش کے ساتھ پاکستان میں ناقدری اور فراموشی کا سلوک روا رکھا گیا اُن کی وفات پر کوئی ردِّ عمل نہیں ہوا لیکن ''جوش شناسی'' کے دوسرے شمارے میں محسن بھوپالی کا مضمون ''جوش کی وفات پر کراچی میں دو اہم تعزیتی اجلاس'' حضور احمد شاہ کا مضمون ''جوش کی تاحیات رکنیت پر کراچی پریس کلب کا سپاس نامہ'' اور ایک پورا باب ''کراچی میں منعقدہ یومِ جوش'' جس میں پانچ مضامین شامل ہیں بہت ساری غلط فہمیوں کو دور کرتے ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اِس قدر بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جتنی شکایت کی جاتی رہی ہے۔ ''میرا مرثیہ'' اور ''تمام اقوام بہتر حالت میں ہیں ہم کیوں نہیں؟'' کے عنوان سے جوش کا مضمون براہِ راست جوش کے خیالات سے واقف کراتا ہے۔ اِس میں جو سوالات اُٹھائے گئے ہیں وہ اکیسویں صدی میں بھی معنوی اور مطالباتی بنے ہوئے ہیں۔

جوش کے پہلے شعری مجموعے ''روحِ ادب'' (۱۹۲۰ء) پر پروفیسر رفیع احمد خاں کا نایاب اور عرصے سے کمیاب مقدمہ جو ۲۵ مئی ۱۹۲۰ء میں لکھا گیا شامل کر کے قارئین کے لئے ایک طرح سے جوش کی سوانح حیات فراہم کی ہے۔ اپنے ہم عصروں سے جوش کے کیسے تعلقات تھے

ثاقب منظر پوری کا مضمون ''جوش اور جمیل مظہری'' اِس پر روشنی ڈالتا ہے۔ ''جوش شناسی'' کے پہلے شمارے کا تجزیہ ڈاکٹر محمد رضا کاظمی نے کیا ہے اور بہت جرأت مندانہ باتیں کی ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں ''جوش پر پابندی لگی جنرل ضیاء الحق کے عہد میں مگر بعد کے جمہوری ادوار میں اردو ڈکشنری کے ذیل میں جوش کے مساعی کا ذکر نہیں کیا جاتا اور تحسین کا سارا اخراج شان الحق حقی کو پیش کر دیا جاتا ہے جو ادارہ کے انتظامی سربراہ تھے۔'' (ص ۱۰۶) پاکستان میں ''جوش بانی'' اور ''جوش شناسی'' کے رسمِ اجراء کو فضیلہ سمدھانی ضبطِ تحریر میں لائی ہیں۔ اِس طرح پاکستان میں جوش کی مقبولیت اور اہمیت سے خاطر خواہ واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ رسالہ ۱۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس کی طباعت پاکستانی ادب پبلی کیشنز، کراچی سے ہوئی ہے۔ قیمت ۱۵۰ روپے ہے۔ تحقیق و تدوین ڈاکٹر ہلال نقوی نے کی ہے۔☆☆

تبصرہ: جوش شناسی
تیسرا شمارہ: نومبر ۲۰۰۸ء
نعیم السحر صدیقی

''جوش شناسی'' کا تیسرا شمارہ نومبر ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ پہلے، دوسرے شمارے کی طرح یہ بھی ایک منفرد فضا رکھتا ہے۔ اور جوش آگاہی کے اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتا ہے۔ یہ شمارہ قارئین کو سب سے پہلے جوش ملیح آبادی سے روبرو کراتا ہے یعنی پہلا مضمون خود جوش کا ہے بہ عنوان ''کچھ اپنے بارے میں'' اِس طرح متواتر تین مضمون اور جوش کے ہیں جو اُن کے افکار سے براہِ راست واقف کراتے ہیں۔ اِس کے بعد جوش پر تنقیدی مضامین ہیں جو بہ عنوان ''لکھ لٹ جوش ملیح آبادی'' ظ۔ انصاری، ''جوش کی شاعری اور اُن کا تفکر میری نظر میں'' پروفیسر منظور حسین شور، ''جوش ذی ہوش'' شان الحق حقی، ''جوش! الفاظ یا غزلوں کا نباض'' ڈاکٹر مظفر حنفی ''جوش اور غزل'' لطف الرحمٰن ''جوش ملیح آبادی، ذات وصفات'' مسعود احمد برکاتی ''جوش صاحب کی یاد کے کچھ دھندلے عکس'' شاہانہ ایلیا ہیں۔

اِس میں شامل جوش کا مضمون ''مقالاتِ زریں'' (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) بہت اہم اور تاریخی ہے جو عام طور سے دستیاب نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ ''جوش شناسی'' کے پہلے شمارے کی طرح ایک بار پھر جوش کی شخصیت اور اُن کے فکر و فن پر مطبوعہ تحریریں: اشاراتی تفصیلات ۱۲ صفحات پر دے کر ہلال نقوی صاحب نے ایک انسائکلو پیڈیا فراہم کی ہے۔ اِس میں جوش پر آج تک جتنی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں اُن کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ جو جوشؔ پر کام کرنے والے طالب علموں کو تحقیقی روشنی دکھائے گی۔ یہ تفصیلات ڈاکٹر ہلال نقوی کی تصنیف ''جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن'' کی کتاب کا حصہ تھیں لیکن کتاب کی رسائی چونکہ بیشتر قارئین تک نہیں ہوسکی ہے لہٰذا واقفیت کی غرض سے اِسے یہاں خصوصیت سے درج کیا گیا ہے۔ شاہانہ ایلیا کا مضمون جو یادداشت پر منحصر ہے بہت فطری اور دلچسپ ہے۔ رسالہ ۱۴۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت دوسو روپے ہے۔ طباعت پاکستانی ادب پبلی کیشنز، کراچی سے ہوئی ہے۔☆☆

گنی چنی تحریریں

مرتب: آصف فرخی

مبصر: عبدالحی

انتظار حسین ہمارے عہد کے ممتاز منفرد افسانہ نگار کالم نویس اور ادیب ہیں۔ انھوں نے یادگار اور بے مثال افسانے تو لکھے ہیں ساتھ ہی مضامین، خاکے، انشائیے، ترجمہ وغیرہ بھی خوب لکھے ہیں اور لکھتے جا رہے ہیں۔ آصف فرخی نے ان تمام پہلوؤں کے پیش نظر ایک عمدہ اور گراں قدر انتخاب کیا ہے جس میں ابتداً اس کتاب کے بارے میں آصف فرخی نے تو لکھا ہی ہے مظفر علی سید۔ محمد عمر میمن۔ گوپی چند نارنگ کے بھی مضامین شامل اشاعت ہیں۔ شخصی احوال کے ضمن میں شمیم حنفی اور خود انتظار حسین کے مضامین ہیں پھر افسانوں کا انتخاب ہے۔ ناول کے اقتباسات ہیں۔ ڈرامہ۔ خودنوشت۔ خاکے۔ انشائیے وغیرہ کے انتخابات پیش کئے گئے ہیں

آخری حصہ میں تنقیدی مضامین ہیں جو بیحد اہم ہیں۔ کتاب کی ابتدا آصف فرخی کے ان جملوں سے ہوتی ہے۔ ''انتظار حسین ایک ایسے تخلیق کار کا نام ہے کہ جس نے ایک پورے عہد کے تجربے کو زبان دی ہے اور اظہار کی صورت عطا کی ہے۔۔۔'' اگر یہ سچ ہے تو اس انتخاب کی واقعی بہت اہمیت ہے۔ خوبصورت گٹ اپ اور خوبصورت تصویر کے ساتھ اس کتاب کو سنگ میل لاہور نے شائع کیا ہے۔ ☆☆

نجوم و جواہر

مبصر: نعیم السحر صدیقی

''نجوم و جواہر'' پہلی بار جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اِس کا مطبوعہ ادارہ پاکستان ٹائمز پریس لاہور، تقسیم کار مکتبۂ ادب جدید لاہور، ناشر جوش اکیڈمی کراچی ہے۔ نجوم و جواہر کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے جسے جوش لٹریری سوسائٹی آف کینڈا نے نومبر ۲۰۰۸ء میں دوبارہ شائع کیا ہے۔ شاید ایسا اس کی کمیابی کے سبب ہوا ہوگا لیکن اِن سب باتوں سے قطعِ نظر یہ کہ یہ جوش کی رباعیات کا ایک بیش قیمتی اور شاہکار مجموعہ ہے۔ جسے پڑھ کر جوش کے فکر و نظر کا تعین کیا جا سکتا ہے اِن رباعیات میں گہرائی، گیرائی اور عمیق مشاہدے کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ انھیں مختلف عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے مثلاً اندیشۂ و ادراک، وقت، فنکار، دہقان و تہذیب، جمالیات، طلوعِ سحر، غروبِ جمال، جلوسِ غم، تازہ بہ تازہ نو بہ نو، نالۂ تشنگی، کربِ سوال۔ ہمیشہ کی طرح اس مجموعے میں بھی اُنھوں نے اپنی پہلی رباعی ''قوت و حیات'' کی نذر کی ہے۔ جسے یہاں درج کیا جا رہا ہے:

اس دُھن میں کہ دل عقل کے شیدا ہو جائیں
آفاق کے اسرار، ہویدا ہو جائیں
مدت سے گرا رہا ہوں، تخمِ افکار
شاید کہ نئے درخت پیدا ہو جائیں

جوش نے جن افکار کی تخم ریزی کی ہے اُس سے نئے درخت ضرور پیدا ہوئے ہیں اور وہ اس طرح کہ انسانی ترقیات کے جن امکانات کو انھوں نے اپنے اشعار میں ظاہر کیا تھا وہ آج حقیقت بن رہے ہیں۔ الہام و افکار میں جو تقریباً اس کے آس پاس ہی شائع ہوا لاتعداد ایسے اشعار ملتے ہیں جو اُن کی سائنسی اور فکری بصیرت کو منعکس کرتے ہیں۔ بہر حال نجوم و جواہر جوش کی رباعیات کا ایک خاص مجموعہ ہے۔ اس کے مختلف حصے جن کے عنوانات بھی قائم کئے گئے ہیں شاعر کی فکری رنگا رنگی کو پیش کرتے ہیں۔ اِس سے قبل جوش کی رباعیات کا ایک مجموعہ ''جنون و حکمت'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں کلیم بُک ڈپو سے جوش کی زندگی ہی میں شائع ہو چکا ہے۔ یوں تو جوش کے تمام مجموعوں کے آخر میں رُباعیات خاصی تعداد میں موجود ہیں اور بہت اچھی رباعیات ہیں لیکن ''جنون و حکمت'' اور ''نجوم و جواہر'' رباعیات کے خاص مجموعے ہیں۔ اِس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ جوش کے یہاں رُباعیات کی تعداد اُن کی نظموں سے کسی طرح کم نہیں۔ اس مجموعے کی رباعیات کے حوالے سے اس کے آخر میں تین مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں۔ جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مضمون بہ عنوان ''جوش کی مضرابِ فکر و فن'' پروفیسر سحر انصاری ''جوش کا شعری رنگ و آہنگ'' مبین مرزا ''چاکِ داماں پہ نثار'' شامل ہیں۔ اِس مجموعے کو اس لئے بھی پڑھا جانا چاہیے کہ یہ ایسے شاعر کے تجربات کا جز ہیں جس نے حیات و کائنات کو اپنے طور پر سمجھا تھا۔☆

☆☆☆

رپورٹ

جوش ملیح آبادی پر کل ہند سمینار: ہریانہ میں

نعیم السحر صدیقی

ہریانہ اردو اکادمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے اشتراک سے دو روزہ کل ہند سمینار ''عہدِ حاضر میں جوش ملیح آبادی کی ادبی وسماجی معنویت'' پر بہ تاریخ ۲۹ اور ۳۰/ دسمبر ۲۰۰۸ء میں منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس ۱۲ بجے دوپہر میں شروع ہوا۔ جناب کشمیری لال ذاکر صاحب نے مقامی اور غیر مقامی مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور تعارفی کلمات ادا کیے۔ اُنھوں نے کہا کہ بہت عرصے کے بعد ہریانہ میں اردو زبان کا پرچم بلند ہوا۔ اُنھوں نے اختر شیرانی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اردو یہیں کی زبان ہے۔ ہریانہ میں حالی پانی پتی، خواجہ احمد عباس، صالحہ عابد حسین، صہبائی، منشی گھمانی جیسے ادیب پیدا ہوئے۔ اردو کا پہلا ناول یہاں لکھا گیا۔ ہم جعفر زٹلی پر بھی سمینار کریں گے۔ ان باتوں کے علاوہ بھی اس دو روزہ سمینار میں وہ وقفے وقفے سے اپنے دلچسپ اور مفید کلمات سے نوازتے رہے اور سامعین سے افکارِ جوش کی نئی دریافت کرنے کی گزارش کی۔ گورنر ، ہریانہ ڈاکٹر اے۔ آر۔ قدوائی صاحب نے افتتاحی تقریر کی۔ اُنھوں نے کہا کہ جوش کو شاعرِ انقلاب کہا جاتا ہے کیونکہ اُنھوں نے نوجوانوں میں ہمت اور ولولہ پیدا کیا۔ اِس طرح اُنھوں نے ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ اُن کی آزادی کی نظمیں آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔ ہم اُنھیں کبھی بھلا نہیں سکتے۔ مانگے رام گپتا، وزیرِ تعلیم ہریانہ نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے تقریر کی۔ ڈاکٹر اے آر قدوائی (گورنر ہریانہ) اور مانگے رام گپتا دونوں نے ہی اِس بات کا

اعتراف کیا کہ ذاکر صاحب نے ہریانہ میں اردو کے حوالے سے بہت سی خدمات انجام دیں۔ جوش کی ادبی وسماجی معنویت پر جناب شاہد ماہلی صاحب نے مختصر تقریر کی۔ استقبالیہ کلمات راجن گپتا کمشنر وسکریٹری، ایجوکیشن ولینگویجز ڈپارٹمنٹ، حکومتِ ہریانہ نے ادا کئے۔ کلیدی خطبہ پروفیسر قمر رئیس نے دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ آج جو ہم اس طرح سے جوش کو یہاں یاد کر رہے ہیں جوش کا ہریانہ سے گہرا تعلق ہے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے جوش کو یہاں بلایا تھا۔ غالب اور اقبال کے بعد جوش سب سے بڑے شاعر ہیں۔ بڑے شاعروں کی یہ پہچان ہے کہ اُنھوں نے اپنے دور اور اپنے بعد کے دور کو کتنا متاثر کیا۔ یہ کام جوش نے بخوبی انجام دیا۔ جوش جب پاکستان چلے گئے تو یہ غور کرنے کی بات ہے کہ کیا وہ دو ملکی اور دو قومی نظریات کی حمایت یا تعریف کرنے لگے؟ نہیں! اُنھوں نے کبھی اِس کی تائید نہیں کی۔ یکجہتی کا سب سے اہم کلام جوش کا تھا۔ اُن کے پاکستان جانے کے بعد بہت ساری غلط فہمیاں پیدا ہوئیں لیکن وہ فن سے زیادہ متعلق تھیں اُن کی وطن پرستی پر کسی نے سوال نہیں اُٹھایا۔ اُنھوں نے پاکستان میں رہتے ہوئے ''یادوں کی برات'' لکھی جس میں اُنھوں نے ہندوستانی کلچر اور اپنے احباب کی تعریف کی اور پاکستان میں اپنی محرومیوں کا ذکر کیا۔ وہ دل سے ہمیشہ ہندوستان میں رہے صرف جسم اُن کا پاکستان میں تھا۔ اقبال حیدر اور علی احمد فاطمی کی جوش فہمی کے لئے کی جارہی کوششوں اور سرگرمیوں کا ذکر بھی قمر رئیس صاحب نے اپنے کلیدی خطبے میں کیا۔ اُنھوں نے ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے'' نظم جسے ہندی اردو دونوں زبانوں میں لکھ کر تقسیم بھی کیا گیا تھا اپنے مخصوص لب ولہجہ میں سنائی۔ جوش لٹریری سوسائٹی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ جوش بانی کو ہندی میں بھی نکالیں گے۔ ہندوستانی تہذیب کے تمام عناصر پر جوش نے زبردست روشنی ڈالی ہے۔ اِس طرح کی اور باتوں کے بعد ہریانہ اردو اکادمی کی مطبوعات ''حالی پانی پتی کی نظمیں (دیوناگری) دوسرا ایڈیشن'' اور سہ ماہی مجلّہ ''جمناتٹ'' کی رسمِ اجراء بھی ہوئی۔ اِظہارِ تشکر شریمتی جیوتی اروڑہ ہائر ایجوکیشن کمشنر، ہریانہ نے کیا۔ اُنھوں نے اپنی تقریر میں سیکولر شعراء کو دریافت کرنے پر زور دیا اور اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے تعاون کا اطمنان دلایا انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں تمام زبانوں کے طلبہ کو اس طرح کے سمیناروں میں مدعو

کرنا چاہئے خواہ وہ مقالے نہ پڑھیں اس سے نہ صرف واقفیت کا دائرہ وسیع ہوگا بلکہ تمام زبانیں ایک دوسرے کے قریب آسکیں گی۔ پہلا اجلاس جس میں مقالے پڑھے جانے تھے ۳ بجے دن میں شروع ہوا۔ پہلا مقالہ ''غلام نبی خیال'' نے ''جوش اور کشمیر'' کے عنوان سے پڑھا۔ اُنھوں نے کہا کہ جوش پر کشمیر کے حوالے سے ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ کشمیر پر جوش کی دو نظمیں ہیں۔ یہ دونوں نظمیں کہیں نہیں ملتی اِنہیں میں نے تلاش کیا ہے۔ عصمت ملیح آبادی نے جو کلیات مرتب کیا ہے اُس میں بھی یہ نظمیں شامل نہیں ہیں۔ اِن کے عنوان ''اے جوانانِ کشمیر'' اور ''اے جنت کشمیر'' ہیں۔ اِن کے علاوہ جوش پر ایک طویل نظم شیخ عبداللہ پر بھی اُنھوں نے سنائی اور کہا کہ کشمیر کے مخصوص پس منظر میں جوش نے یہ نظمیں لکھی ہیں۔ اِس کے علاوہ جوش نے اپنی وہ مشہور رباعی:

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی
ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

۱۹۳۱ء میں کشمیر میں تحریکِ حریت کی جب بنیاد ڈالی جا رہی تھی اُس موقع پر پڑھی تھی۔ نعیم السحر صدیقی نے ''جوش کی شاعری میں ماضی کی بازیافت کا عمل'' مہندر پرتاپ چاند نے ''جوش اور نظریۂ عشق'' اور شاہد ماہلی نے ''جوش کی شاعرانہ عظمت'' پر مقالے پیش کئے۔ مہندر پرتاپ چاند نے کہا کہ جوش کی شاعری کے تمام میلانات کی تان عشق بازی پر ہی آکر ٹوٹتی ہے۔ وہ اپنی تمام شعری عظمت معشوقوں کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ محبِّ انسانیت ہی نہیں محبِ وطن بھی تھے۔ عشق جوش کی شخصیت کا ایک لطیف پہلو ہے۔ شاہد ماہلی نے کہا کہ جوش نے اپنی انقلابی شخصیت سے ایک الگ پہچان بنائی۔ جوش آخر تک مشترکہ ہندوستان کے حامی رہے۔ وقت کا دھارا بھی اُنہیں اِس سمت بڑھائے جا رہا تھا۔ جاگیردارانہ تہذیب سے بغاوت بھی ایک طرح سے انگریز دشمنی کے مترادف ہے۔ اِس اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس اور عبدالرحمٰن صاحب نے کی۔

دوسرا اجلاس ۳۰ دسمبر کو ۱۱ بجے دن میں شروع ہوا۔ پہلا مقالہ فاروق ارگلی نے ''جوش ہر دور کا شاعر'' کے عنوان سے پڑھا۔ اُنہوں نے کہا کہ جوش کے فن اور فکر اور شخصیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اُن کی اہمیت آنے والے ادوار میں بھی برقرار رہے گی۔ اُن کا انسان اپنی فطری صلاحیتوں سے آفاق کو مسخر کرسکتا ہے۔ جوش کی شاعری اپنے سیاق وسباق کے اعتبار سے ایک زندہ اور توانا شاعری ہے۔ جوش ایک نہیں دو شخصیت ہیں۔ انقلابی شاعری کا حصہ حسن وعشق اور شراب وساغر بھی ہوسکتے ہیں۔ وہ پیدائشی باغی تھے۔ اُنہوں نے علم وفن کے میدان میں بہت کامیابی حاصل کی لیکن مصلحت نہ سیکھ سکے۔ اِس لئے ظاہر پرستوں نے نکتہ رس جوش کو سمجھا ہی نہیں۔ دوسرا مقالہ پروفیسر قمر رئیس نے ''جوش کی شعریات کے تشکیلی پہلو'' کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہر بڑے شاعر کی اپنی شعریات ہوتی ہے۔ لکھنؤ میں فکر وفن نے جب اپنی جگہ پیدا کی تو اُس سے جوش نے بھی استفادہ کیا۔ توانا جذبات اور مثبت پہلوؤں نے اُن کی شخصیت میں نکھار پیدا کیا۔ احتجاج اُن کی شاعری کا توانا وصف ہے اگر اِس کو اُن کی شاعری سے الگ کردیا جائے تو اِس کے خالق کی پہچان نہیں ہوسکتی۔ باغیانہ جذبات کو اُن کی شاعری میں قدرِ اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ طنزیہ عناصر جا بجا جوش کی شاعری میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اُن کی شاعری کا ایک نمایاں وصف اُن کا جدلیاتی انداز بھی ہے۔ اِن باتوں کی تائید میں پروفیسر قمر رئیس نے بہت سی مثالیں دیں۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے کہا کہ جوش نے جو نئی راہ نکالی وہ ناسخ دبستان کے ساتھ حالی کے دبستان کی تائید کرتا ہے۔ اُن کا تخیل زرخیز اور زر افشاں تھا اُن کے یہاں الفاظ کی کثرت شعری سبک روی کو دبا لیتی ہے لیکن ایسا تمام نظموں میں نہیں ہے۔ وہ انسان کے خیال ہی نہیں نفسی اور نفسیاتی حقائق سے بھی قاری کو متعارف کراتے ہیں۔ بندھے ٹکے اصولوں پر اپنا تخلیقی سفر جوش نے طے نہیں کیا۔ فطرت کی رعنائیاں اُن کے وجود کا فعال حصہ بن گئی تھیں۔ نظم ''ناخدا کہاں ہے'' اِس میں انقلابی اور سیاسی پہلوؤں کی بڑی اچھی ترجمانی جوش نے کی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے اپنا مقالہ مختصر کرنا چاہا لیکن سامعین نے فرمائش کی کہ آپ پورا مقالہ پڑھیں۔ اُنھوں نے آخر میں کہا کہ جوش کی شعریات کا دھارا بہت وسیع ہے جس پر علمی اور معروضی تنقید کی ضرورت

ہے۔ گلشن کھنّا نے ''عہدِ حاضر میں جوش ملیح آبادی کی ادبی اہمیت'' دیپک ٹنڈن نے ''جوش کی شاعری میں ادبی اور سماجی معنویت'' ڈاکٹر فرزانہ نے ''جوش کی شاعری میں سماجی مسائل'' محمد مستمر نے ''جوش کی شاعری میں عورت کا تصور'' ڈاکٹر کملیش موہن نے ''جوش ایک بے گھر انقلابی شاعر'' کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کئے۔ اِن سبھی نے بہت ہی مدلل اور منطقی باتیں کیں جنھیں طوالت کے خوف سے پیش نہیں کیا جا رہا ہے لیکن اِس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کم وقعت تھے۔ ڈاکٹر کملیش موہن نے کہا کہ ''عہدِ غلامی کا ضبط شدہ ادبی سرمایا ہمارا خزانہ ہے اور نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے'' اس خزانے کا ایک ہیرا ہے'' آخر میں پروفیسر قمر رئیس نے تقریر کی اور ذاکر صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

☆☆☆

خطـــوط

۲۲/جنوری ۲۰۰۹ء
محب مکرم! تسلیم

جوش بانی ۲ موصول ہوا۔اس عنایت کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔

اس خوبصورت جریدے کے توسط سے جوش شناسی کا تحرک بڑا مستحسن قدم ہے جس کے لئے آپ اور اقبال حیدر دونوں ہم اہل اردو کے شکریے کے مستحق ہیں۔

جوش بلاشبہ ایک بڑے نظم گو شاعر تھے جن کے قدرت کلام کی مثال انیس اور نظیر کے علاوہ اردو میں شاید کہیں اور نہ ملے۔ان کی شاعری میں جو تنوع ہے جلال و جمال ہے اس میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ان کے کثیر جہتی شعری رویے ان کو ایک ایسا شاعر بنا دیتے ہیں جن کا فی الحال کوئی حریف نہیں ہے۔لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود آج کے دور سے ان کا حوالہ شبہات سے ماورا نہیں ہے۔جوش بانی ۱ پر تجزیہ اور تبصرہ ایم اے قدیر نے پیش کیا وہ جوش کی ہشت پہلو شاعری اور آج کے دور سے اس کے RELEVANCE کو بہت خوبی سے اُجاگر کرتا ہے۔ انھوں نے جوش کی مثال اکبر الہ آبادی کی شاعری سے دے کر ایک بالکل نیا نکتہ پیش کیا ہے جو قرین حقیقت بھی ہے اور قابل غور بھی ہے۔اکبر الہ آبادی میں جو تخلیقی وفور تھا، ندرت فکر ونظر تھی اور الفاظ وتراکیب کے فنکارانہ استعمال کی روشنی تھی وہ ان کو ایک عدیم المثال شاعر کی حیثیت دیتی ہے، تاہم آج کے دور سے اس کا کیا حوالہ ہے۔ یہ جگ ظاہر ہے۔ جوش کی شاعری بھی فقید المثال ہونے کے باوجود آج کے دور کی چیز نہیں ہے اس میں آفاقیت کے عناصر تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے جمالیاتی وفور کی بعض نظمیں قاری کو لطف وانبساط سے شرابور کرتی رہیں گی مگر ان کی شاعری کا کینوس اتنا وسیع ہونے کے باوجود نقوش جاودانی سے خالی ہے۔

نئے شمارے میں سید محمد عقیل رضوی نے اپنے مقالے کے عنوان میں جانے کیوں انگریزی لفظ ملیٹنسی کو شامل کرلیا ہے جبکہ انھوں نے خود ہی اس لفظ کا ترجمہ جنگ جوئیت'' کیا ہے

جونہایت مناسب اور درست ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ جوش بانی میں کتابوں پر تبصرے بالکل بے میل اور اجنبی لگتے ہیں۔ان تبصروں کے صفحات پر اگر آپ جوش کا کلام یا ان کی رباعیات چھاپ دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا باقی مضامین ابھی پڑھ رہا ہوں۔

آپ کے اداریے کے پہلے حصے میں جو دردمندی اور دلسوزی ہے، اس سے میں بہت متاثر ہوا۔خاص کر اردو کے مصنفین کے بارے میں یہ شکایت کہ بے باکی اور حق گوئی کے بجائے وہ مصلحت آمیز خاموشی کے شکار ہو گئے ہیں صدفی صد درست ہے۔علیگڈھ اور لکھنؤ پر ہم اہل اردو کو بہت ناز ہے لیکن ان دونوں شہروں میں جو مصلحت آمیز خاموشی بلکہ بے حسی ہے وہ قابل افسوس ہے۔

نامی انصاری، کانپور

☆☆

برادرم فاطمی۔۔۔۔۔۔اسلام علیکم

جوش بانی، کا دوسرا شمارہ ملا۔شکریہ۔ مجھے شروع سے ہی جوش کی شاعری میں بڑی دلچسپی رہی ہے اور اس بات کا شدّت سے احساس رہا ہے کہ جوش کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔آپ حضرات کی کوشش اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مستند ناقدوں اور ادیبوں کو آپ لوگوں نے جوش کی شعری تخلیقات کے بے لاگ اور سنجیدہ تجزیہ کے لئے اعلیٰ درجہ کا جریدہ فراہم کیا اور صحیح افہام وتفہیم کے دروازے وا کئے۔یہ ایک بڑا وقیع ادبی اقدام ہے۔ہر باشعور اور سنجیدہ قاری اس کی اہمیت کا اعتراف کرے گا اردو شاعری کے جس دھارے کی سب سے اہم اور پڑوقار آواز مرزا رفیع سودا تھے اُس دھارے کے سب سے بڑے شاعر عہد جدید میں جوش ملیح آبادی تھے۔میری طالب علمی کے زمانے میں مجتبیٰ حسین نے جوش پر بڑے خیال انگیز مضامین لکھے تھے۔ان کو تلاش کر کے پھر شائع کیجئے۔آپ کے ساتھ عہد حاضر کے نکتہ سنج اور ذہین ادبا اور قارئین کا کارواں ہے۔اتنا سنجیدہ اور بھرپور رسالہ شائع کرنے کے لئے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔امید ہے کہ آپ لوگ بخیر ہوں گے۔

محمد غنی رضوی، گیا

برادرم علی احمد فاطمی

جوش بانی کا دوسرا شمارہ ملا۔اس کے لئے بیحد شکریہ۔رسالہ اس اعتبار سے اہم اور منفرد بن جاتا ہے کہ یہ برصغیر کے ایک بڑے شاعر جوش کے ادب کو موضوع بنانے میں کامیاب ہے اور فکر انگیز مضامین شائع کررہا ہے۔اطلاعاً عرض ہے کہ جو مقالہ میں نے جوش پر پڑھا تھا اسے زمانے اور نظر ثانی کے بعد ذہن جدید کے اگلے شمارے میں شریک کیا جارہا ہے۔پاکستان میں اس کے دنیازاد میں اشاعت پذیر ہونے کا امکان ہے۔پھر ایک بار جوش بانی کے لئے شکریہ۔

مخلص

زبیر رضوی

☆☆

محبِّ مکرم پروفیسر فاطمی۔آداب

جوشیات پر مشتمل عالمی جریدہ جوش بانی موصول ہوا۔جوش کے سلسلے میں ناحق لوگ مختلف آندارادہیں۔جوش نظم کے شاعر ہیں اور زبردست شاعر ہیں۔جگر سے بھی تقابل بے سود۔جگر غزل کے خوش گو شاعر ہیں۔صرف ایک لفظ میں ان کی شاعری کا Essence والہانہ سرمتی ہے جہاں تک اقبال کا سوال ہے تو جوش کے ساتھ گھسینا بے کار ہے۔اقبال کے پاس ایک منظم فلسفہ حیات ہے۔ہمیں صرف دیکھنا یہ ہے کہ جوش اپنی شاعرانہ صلاحیت یعنی Potentiality اور اپنی Dormant quality کو کھنگالنے میں کہاں تک کامیاب ہیں۔آپ کچھ بھی کہئے نظم گوئی میں ان کا ثانی نہیں (بہ استثنائے اقبال) الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔لفظوں کا سیلاب ٹھاٹھیں ماررہا ہے پھر یہ محض الفاظ کا انبار نہیں لگاتے شعری حظ پیش نظر رہتا ہے۔جوش کی شاعری محض Versification نہیں بلکہ Poetry ہے ایسا قادرالکلام شاعر انیسؔ ہے یا جوش۔جو شعراء جوش کو Poor شاعر سمجھتے ہیں۔جوش کو Follow کرتے ہوئے ایک آدھ ہی شعر کہہ کے دیکھیں قدم قدم پر لڑکھڑائیں گے۔بلاشبہ جوش اقبال یا غالب کی طرح عظیم شاعر تو نہیں مگر ہمارے بڑے شاعروں میں ایک شاعر ہیں۔اردو شاعری میں ان کے contribution کو

نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا شاعر جس کو احساسات وجذبات وافکار کے اظہار پر حاکمانہ قدرت ہو جس نے نظم گوئی کو لباس شاہی عطا کیا ہو اس پر تنقید محض برائے تنقید ہے اس تنقید سے جوش کا قد کم نہیں ہوتا۔

شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنا موقر جریدہ جوش بانی اس حقیر فقیر کو ارسال کیا۔ شکریہ

امین اشرف، علی گڈھ

☆☆

جناب۔۔۔آداب

عبدالاحد ساز کا جوش بانی پر تبصرہ پڑھا۔

جوش نیاز فتح پوری۔ محمود شام۔ سرشاد صدیقی۔ ماہر القادری وغیرہ نہیں تھے وہ شبیر حسن خاں تھے کراچی کے کمشنر نقوی نے سبز باغ دکھا کر اسیر دام فریب کرلیا تھا ممنوع شجر سے لطف پیہم لینے والے اللہ سے انتقام آدم لینے والے۔ جوش پاکستان کے نام نہاد اسلامی معاشرے میں کھپ ہی نہیں سکتے تھے اس لئے بھیانک ذہنی کرب سے دوچار ہوئے۔

میں نے جوش کو بہت قریب سے دیکھا ہے میرے استاد گرامی قدر بسمل سعیدی صاحب اُن کے قدیمی دوست تھے اس لئے مجھے معلوم ہے کہ جوش کے خلاف فضا تیار کرنے میں عشق ٹونکی نے بھی اہم رول ادا کیا تھا۔ عشق نیم خواندہ متشاعر جوش صاحب کا ہم پیالہ وہم نوالہ ''درباری'' تھا۔ جوش صاحب پہلی بار پاکستان سے ہندوستان آئے تو وہ بھی ہمراہ تھا واپس جانے کے بعد نہ جانے کیوں اس نے پاکستانی حکام کو جھوٹی خودساختہ داستانوں کے ذریعہ گمراہ کیا اور یہ باور کرایا کہ جوش نے ہندوستان جاکر بدترین قسم کی پاکستان دشمنی کا مظاہرہ کیا تھا اور علاوہ ازیں روزنامہ جسارت اور ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور کے مُدیر قریشی نے جو جماعت اسلامی پاکستان کے اہم رکن بھی ہیں پاکستان کے اُس بینک کے رعائی عہدیداران سے ایک منظم سازش کے تحت لاکر سے وہ مسودہ یادداشت نکلوا کر فوٹو کاپی شائع کردیا جو جوش صاحب نے اس معاہدے کے ساتھ محفوظ کیا تھا کہ ان کی موت کے بعد ہی اس کو پبلش کردیا جائے۔ بینک والوں نے معاہدے کی خلاف

ورزی کی اور اس طرح جوش صاحب کی حیات میں کاغذات شائع کر دیے گئے جن میں محمد علی جناح کی ہجو درج تھی اور جوش صاحب نے نظریہ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ جناح کو پاکستان میں خدا اور رسول کے بعد کا درجہ دے دیا گیا ہے اور جاگیردارانہ نظام کے چھتر سایہ میں دولتمندوں وڈیرے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی شادی قرآن سے علی الاعلان کر رہے ہیں جھوٹے نام و ناموس کی خاطر عورتوں کو سنگسار کیا جا رہا ہے۔ زندہ دفن کر دیا جاتا ہے۔ ان نام نہاد اسلامی مملکت میں لاہور کی ہیرامنڈی آج بھی آباد ہے۔ سیکڑوں ہیرامنڈیاں ہر شہر میں ہیں۔ ہم حسن پرستی کے مرکز ہیں۔ فحاشی و بدکاری عام ہے۔ دراصل پاکستان مغربی اور مشرقی رشتوں کا بیہودہ سنگم ہے۔ امریکی سامراج کی اس سب سے بڑی فدآبادی میں جوش گئے اور ویران راہوں میں قسط وار موت سے ہمکنار ہو گئے۔ جوش کی بازیافت بیحد ضروری تھی جوش بانی کا خیر مقدم بیحد ضروری ہے۔

مخلص

آزاد قاسمی، ٹونک

ہولی کا رنگ: سرحد کے پار

ایم۔ اے قدیر

(انڈو پاکستان پی پلس فورم فار پیس اینڈ ڈماکریسی کے ہولی پروگرام میں
پاکستانی مہمانوں کی آمد کے سلسلے میں کہی گئی نظم)

بہت پر لطف ہے اے دوستوں تیوہار ہولی کا — چلو دیکھیں کہ کیسا رنگ ہے اس بار ہولی کا
سنا ہے ہولیکا، پرہلاد کی ہستی مٹانے کو — دہکتی آگ میں بیٹھی تھی خود اس کو جلانے کو
نتیجہ تو ہوا وہ ہی جو منظور الٰہی تھا — برائی مات کھائی اور بھلائی کا بجا ڈنکا
اسی کی یاد میں سنتے ہیں سب ہولی مناتے ہیں — بھلا کر دشمنی مل کر خوشی کے گیت گاتے ہیں
یہ بھارت دیش ہے سب کا نہ ہے اِنکا نہ ہے اُنکا — بہت رنگین گہوارہ ہے تہذیب و تمدن کا
ادب، سنگیت، رقص و رنگ کی ہیں لاکھ ترکیبیں — یہاں پلتی ہیں جانے کتنی رنگا رنگ تہذیبیں
انہیں پھولوں کو جب ہم ایک جا مل کر سجاتے ہیں — تو سارے رنگ مل کر ایک گلدستہ بناتے ہیں
چلو اس رنگ کی برسات میں ہم بھی نہا ڈالیں — کہ دنیا سے کدورت اور نفرت کو مٹا ڈالیں
محبت سے ہمارا دل پسیجے آنکھ بھی بھیگے — تبسم کچھ تو آخر مفلسی کے ہونٹ پر ناچے
نہ ہو جس میں خوشی وہ پیار کی بولی نہیں ہوتی — فقط کپڑے بھگو لینے سے تو ہولی نہیں ہوتی
منائیں آؤ ہم اس بار تھوڑی مختلف ہولی — بنائیں ایک امن و آشتی کی خوشنما ٹولی
کہ اب انسانیت کو رنج اور غم سے نہ تڑپائیں — سلگتی آدمیت پر خوشی کے رنگ برسائیں
مفاد باہمی کا رنگ چاروں سمت چھا جائے — بھلائی جیت جائے اور برائی مات کھا جائے
جو حائل بیچ میں ہے بدگمانی دور ہو جائے — اڑاؤ رنگ کچھ ایسا کہ سرحد پار تک جائے

☆☆☆

(صفحہ 6 سے آگے)

راقم الحروف سے، جوش اور جوش بانی سے ان کا کیسا گہرا اور نظریاتی اور جذباتی رشتہ تھا یہ ایک لمبی داستان ہے جس کے کچھ حصے ہم اگلے شمارے میں پیش کریں گے۔ فی الحال تو اتنا ہی کہ اردو دنیا ایک قد آور ادیب، ایک عالم باعمل سے محروم ہوگئی۔ ترقی پسند تحریک کا مضبوط ستون منہدم ہوگیا۔ جوش بانی کی ٹیم بے سہارا ہوگئی راقم الحروف تو جیسے یتیم ہوگیا۔ ہم نے گزشتہ برس ان کی پچاس سالہ خدمات کا جشن منایا تھا پیش ہیں اس وقت کی لکھی گئی تعارفی نوعیت کی تحریریں۔

اردو کے ممتاز مقبول ترقی پسند ادیب و ناقد، شاعر و دانشور پروفیسر قمر رئیس نے اس سال (۲۰۰۸ء) اپنی عمر کے پچھتر (۷۵) اور اپنی تصنیفی زندگی کے پچاس سال پورے کر لیے۔ ۱۹۵۸ء میں قمر رئیس کی پہلی کتاب ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ'' شائع ہوئی تھی، جسے اُسی سال یو پی گورنمنٹ نے سال کی عمدہ تصنیف کے بطور انعام و اعزاز سے نوازا تھا۔ یہ کتاب دراصل ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ تھا جسے انھوں نے رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔ خود نگراں پروفیسر صدیقی جو پریم چند کے بہت قائل نہ تھے لیکن قمر رئیس کی عرق ریزی اور معروضی نقطۂ نظر سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ پریم چند کے بھی قائل ہوئے۔ اردو میں آج بھی پریم چند سے متعلق یہ کتاب سند کا درجہ رکھتی ہے۔

قمر رئیس کا اصل وطن شاہ جہاں پور ہے جہاں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ گھر کے علمی و ادبی ماحول نے انھیں روایتی طور پر شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جب وہ لکھنؤ پہنچے تو وہاں بھی شعر و شاعری کا ماحول تھا۔ لیکن چند ایسے اساتذہ بھی ملے جنھوں نے فکر و نظر کی سنجیدہ راہوں پر ڈال دیا۔ احتشام حسین، آل احمد سرور، مسعود حسن رضوی ادیب، محمد حسن وغیرہ کی سرپرستی اور اقبال مجید، احمد جمال پاشا، عابد سہیل، حسن عابد، سبط اختر وغیرہ کی دوستی نے ان کی کایا پلٹ کر دی۔ اس کے بعد علی گڑھ کا علمی و ادبی ماحول، رسالہ ادیب اور علی گڑھ میگزین کی ادارت اور ملک میں ترقی پسند تحریک کا زور و شور۔ خود قمر رئیس کا شعور و وجدان غرض کہ ایک نئی راہ قمر رئیس کی منتظر تھی۔۔۔ وہ دہلی آئے تو خواجہ احمد فاروقی نے جو ایک بہت بڑے پارکھ تھے، علمیت

وصلاحیت پر گہری نگاہ رکھتے تھے، قمر رئیس کو پہچانا اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے بطور استاد وابستہ کرلیا۔ دہلی نہ صرف ایک بڑی جگہ تھی بلکہ غور وفکر، علم وعمل کی ایک کشادہ آماجگاہ بھی۔

نوجوان، محنتی قمر رئیس محض درس وتدریس میں ہی نہیں بلکہ مطالعہ ومشاہدہ میں مصروف ہوگئے۔ اس درمیان انھوں نے نہ صرف پریم چند پر مزید کام کیا بلکہ مختلف موضوعات پر گراں قدر مضامین لکھے جو ہندو پاک کے رسائل میں شائع ہوکر مقبول عام ہونے لگے اور جب ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''تلاش وتوازن'' (۱۹۶۸ء) شائع ہوا تو صاف اندازہ ہوا کہ ان کی تحریروں میں ترقی پسندی کی تعبیر نو، ادب کو نئے تناظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کی للک انھیں سجاد ظہیر واحتشام حسین، سردار جعفری وغیرہ سے نہ صرف الگ کررہی ہے بلکہ تاریخ وتہذیب، علم وشعور کو نئے معنی سے ہمکنار کررہی ہے۔ اس مجموعہ کے کئی اڈیشن شائع ہوئے۔ اس کے مضامین اردو ناول کا تشکیلی دور، جدید اردو ناول اور پریم چند کی کہانیاں تحقیقی نقطۂ نظر سے بے حد مقبول ہوئے۔ پہلی بار یہ مضامین وقار عظیم، مجنوں گورکھپوری وغیرہ سے بہت الگ سے لگے۔

اس درمیان انھوں نے ترقی پسند تحریک کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔ اندازہ ہوا کہ اس میں بھی نئی فکر اور نئی جان ڈالنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس انھوں نے اپنے چند دوستوں حسن نعیم، اجمل اجملی، شہاب جعفری وغیرہ کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل نو میں نمایاں حصہ لیا۔ مدتوں وہ اس کے جنرل سکریٹری رہے۔ اس کے بعد صدر۔ اس کی کئی بڑی کانفرنسیں کیں اور اردو کے نئے ادیبوں، شاعروں کو اس سے وابستہ کیا۔ راقم الحروف کو اس سے وابستہ کرنے اور کل ہند انجمن کے جنرل سکریٹری کے عہدے تک پہنچانے میں قمر رئیس کا ہی ہاتھ ہے۔ اسی سے وابستہ انھوں نے کئی رسالے نکالے۔ مثلاً ''عصری آگہی''، ''نیا سفر''، ''آب وگل'' وغیرہ نے بڑے نمایاں نمبر شائع کیے اور اداریوں میں نہایت کارآمد قسم کی بحثوں کا آغاز کیا۔ اسی طرح ان کے اپنے طبع زاد مضامین ان کی اپنی دو کتابوں ''تنقیدی تناظر'' اور ''تعبیر وتحلیل'' میں شامل ہوکر منظر عام پر آئے۔ ان کاموں اور کتابوں نے قمر رئیس کی ناقدانہ اور دانشورانہ حیثیت پر اعتبار کی مہر لگادی۔ ترقی پسند تنقید کی وہ روایت جسے سجاد ظہیر، احتشام حسین، محمد

حسن وغیرہ نے قائم کیا تھا اسے قمر رئیس نے مزید وسعت عطا کی جس میں ان کا اپنا مخصوص مارکسی نقطۂ نظر اور اس سے زیادہ تہذیبی پس منظر اور معروضی فکر ونظر کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، رشید جہاں اور نئے ناولوں اور افسانوں پر لکھے گئے ان کے گراں قدر مضامین نے فکشن کے بڑے ناقد کی پہچان بنائی۔ لیکن ایسا نہ تھا کہ وہ شاعری سے کٹ گئے ہوں۔ فیض، مجاز، سردار جعفری، کیفی اعظمی وغیرہ پر لکھے گئے مضامین نے ان کی شعری تفہیم اور شاعرانہ فکر وشعور کے نئے نئے ابعاد پیش کیے۔ درمیان میں تاشقند چلا جانا، روسی زبان اور ازبکی شعروادب سے وابستگی نے اور وسط ایشیائی تہذیب کے گہرے مطالعہ نے ان کی ذہن اور وژن کو مزید جہت اور وسعت عطا کی۔ قمر رئیس نے نجانے کتنے قومی وعالمی سیمنار کیے اور شرکت کی۔ نجانے کتنے بیرونی ممالک کا سفر کیا۔ نجانے کتنے اداروں سے وابستہ رہے۔ آج بھی وہ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین ہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر۔ ''نیا سفر'' اور ''جوش بانی'' کے مدیر۔ اور بھی نجانے کہاں کہاں اور کیا کیا۔ غرضکہ پچھتر سال کے قمر رئیس اب ایک دبستان بن چکے ہیں۔ دبستان علم وعمل۔ دبستان فکر ونظر۔ لیکن ان میں سب سے نمایاں حیثیت ان کی ایک عالم اور دانشور کی ہے۔ ایک ترقی پسند ادیب وناقد کی۔ اس کی وجہ ان کا کام ہی نہیں ان کی کتابیں اور مضامین ہی نہیں بلکہ ان کا وہ لچکدار حقیقی اور معروضی رویہ ہے جو ادب اور زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کو سمجھنے اور سمجھانے کی مخلصانہ کوشش کرتا ہے اور اس عمر میں بھی تبدیلیوں کا نہ صرف استقبال کرتا ہے بلکہ نئے خیالات اور نئے لکھنے والوں کو اپنا ہم سفر اور ہم نظر سمجھتا ہے۔ ایک ایسے ماحول میں جبکہ اکثر بزرگ شاعر وادیب۔ نقاد نئی فکروں اور قدروں سے بیزار رہتے ہیں اور نئے لکھنے والوں سے دوریاں بنا کر رہتے ہیں قمر رئیس کا ان کے درمیان گھلنا ملنا، ان سے ہم آہنگ ہو کر چلنا۔ ان کی زندگی اور ان کی ترقی پسندی کو خود بڑا اور معتبر بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قمر رئیس ایک پسندیدہ شخص ہی نہیں ایک مانوس اور مقبول ادیب وناقد اور شاعر ودانشور ہیں۔

تنقید سے ہٹ کر یہاں میں ان کی دو کتابوں کا ذکر بطور خاص کرنا چاہوں گا۔ پہلی کتاب ہے ''ازبکستان۔ انقلاب سے انقلاب تک'' جو ایک سفرنامہ تو ہے لیکن وسط ایشیا کی تاریخ

وتہذیب پر شگفتہ زبان میں لکھی گئی ایسی معرکے کی کتاب ہے جوایک نئے قمر رئیس کا تعارف کراتی ہے۔اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قمر رئیس کی تخلیقی نثر کا جادو تو چلتا ہی ہے ایک مخصوص قسم کے جمالیاتی شعور کا احساس بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔

دوسری کتاب ہے ان کا شعری مجموعہ ''شام نوروز'' جس کے پچھلے دنوں بڑے چرچے رہے۔شاہ جہاں پور کا وہ شاعر جو تعلیم وتعلم اور تدریس وتحقیق کے چکروں میں پھنس کر کہیں گم ہو گیا تھا وہ تاشقند پہنچتے ہی پھر سے زندہ ہو گیا۔قمر رئیس کا شاعرانہ ذہن اور جمالیاتی احساس جو اکثر ان کی تنقید میں بھی جھلکتا ہے اور جس کی وجہ سے خشک تنقید بھی تر نظر آنے لگتی ہے چنانچہ انھوں نے خوب غزلیں و نظمیں کہیں۔''شام نوروز'' کی شاعری کا مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ایک ادیب و ناقد کی شاعری ہے بلکہ اس کے برعکس ایک مکمل و مجسم شاعر کا وجدان و تخیل دھڑکتا نظر آتا ہے۔ایک مکمل شاعرانہ رچاؤ۔اسلوب بیان اور رنگ و آہنگ۔۔۔۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قمر رئیس نے اپنے اندر کے شاعر اور اس سے زیادہ عاشق کو کبھی مرنے نہیں دیا بلکہ عاشق تو کچھ زیادہ ہی زندہ اور متحرک رہا۔فیض نے کبھی کہا تھا:

کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

پھر تنگ آ کر دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

لیکن قمر رئیس نے کچھ ادھورا نہ چھوڑا۔دونوں ہی کام مکمل کیے اور آج بھی اس کی تکمیل میں رواں دواں ہیں۔آج بھی با مقصد اور با عمل فکر و نظر کا سفر جاری ہے۔کیوں نہ ہو قمر رئیس صرف قمر رئیس نہیں بلکہ مصاحب علی خاں بھی ہیں۔شاہ جہاں پور کا البیلے پٹھان جو بھی کام کرتا ہے مکمل کرتا ہے اور بھرپور طریقے سے کرتا ہے۔قمر رئیس کی علم وعمل اور محبت اور محنت کی زندگی بھرپور ہے۔ایک مکمل دبستان۔جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

افسوس صد افسوس کہ ایسا ہمہ جہت اور بالغ النظر ادیب اچانک ہمارے درمیان سے رخصت ہو گیا اور اسکے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک و تفکیر کے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ایسے جاں باز بیباک اور بانکے ادیب و شاعر و دانشور کو جوش بانی کی ٹیم آخری سلام پیش کرتی ہے۔☆☆

Josh Bani (3) - A Literary Book Series

''کناڈا کے شہر کیلگری میں جوش کے ایک قدر شناس اور ہمارے عزیز دوست اقبال حیدر اکثر جوش پر مذاکرے اور ادبی محفلیں برپا کرتے رہتے ہیں۔ تقریباً ربع صدی قبل انھوں نے اس شہر میں ایک جوش لٹریری سوسائٹی قائم کی تھی۔ وہ خود شاعر ہیں، نقاد ہیں، جوش سے عقیدت دراصل ان کو اپنے علم دوست والد بلکہ انکے خانوادے سے ورثہ میں ملی ہے۔ ان کی دو بہنیں شائستہ اور ناہید بھی (منجملہ دیگر افراد خاندان) جوش شناسی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ چند برس قبل جب ہم لوگ (پروفیسر علی احمد فاطمی) کیلگری میں ملے اور جوش کی از سرِ نو تلاش کے مسائل پر گفتگو ہوئی تو ''جوش بانی'' نام کے سہ ماہی مجلّہ کی اشاعت کی تجویز پر ہم سب نے نہایت جوشیلے ڈھنگ سے لبیک کہا۔ اقبال حیدر صاحب نے صاف لفظوں میں واضح کیا کہ ہمارا مقصد کسی جذباتی تحریک کے زیرِ اثر جوش کی عظمتوں کا سراغ لگانا نہیں بلکہ اس مجلّہ کے وسیلے سے جوش بے زاری یا بے اعتنائی کی اس فضا کو تحلیل کرنا ہے جو سرحد کے دونوں جانب دیکھی جاتی ہے۔ اور اس طرح جوش کے حقیقی منصب کی تلاش و تعمیر کر کے آہستہ آہستہ اسے اس طرح قائم کرنا ہے کہ جوش ہی نہیں بیسویں صدی کے ادب کی تاریخ کے ساتھ بھی انصاف ہو سکے۔

بس اس کے سوا ''جوش بانی'' کے اجراء کا کوئی دوسرا مقصد و مدعا نہیں ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہم اہلِ قلم حضرات کو اس مجلّہ کے لئے لکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ البتہ اگر کچھ نوجوان ادیب اس مہم سے تحریک پا کر جوش کا بالا استیاب مطالعہ کر کے کوئی علمی کتاب لکھنا چاہیں تو ادارہ ان سے ممکنہ تعاون کرے گا۔''

قمر رئیس